فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام

بسم الله
الرحمن
الرحيم

فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام

نام کتاب:	فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام
مؤلف:	استاد سید جواد نقوی
ترتیب:	مرکز تحقیقاتِ اسلامی بعثت
ناشر:	متاب پبلیکیشنز
اشاعت اول:	ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ (اکتوبر 2012 عیسوی)
تعداد:	۲۰۰۰

⌘ جملہ حقوق بحق متاب پبلیکیشنز محفوظ ہیں ⌘

عرضِ ناشر

دنیا میں جب بھی کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو ذہنِ انسانی میں اس سے متعلق کچھ بنیادی سوالات ابھرتے ہیں کہ یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟! اس کے پیچھے کارفرما عوامل، اسباب اور محرکات کیا تھے؟! اور یہ کن مقاصد کے حصول کے لیے برپا ہوا؟!

جب انسان ان سوالات کے جوابات پالیتا ہے تو اس کے بعد اس واقعہ کی تفصیلات کی فکر کرتا ہے، اس کے برعکس اگر ان بنیادی سوالات کا صحیح اور حقیقی جواب نہ مل سکے تو اس کا ذہن انہی سوالات کے جوابات کی جستجو میں محور رہتا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ کربلا کا واقعہ جو کہ اسلام و عالمِ اسلام بلکہ پورے عالمِ انسانیت کی بقاء کیلئے انتہائی کلیدی حیثیت کا حامل ہے اس کے اسباب و وجوہات اور مقاصد کی طرف ہماری توجہ کم اور اس کی ذیلی تفصیلات کی طرف زیادہ ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے قیام کے ہدف و مقصد اور اس کے عوامل و اسباب کے بارے میں لوگوں کے درمیان مختلف نظریات و خیالات پائے جاتے ہیں۔ مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے تحریکِ امام حسین علیہ السلام کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ قیامِ امام حسین علیہ السلام سے متعلق ہزاروں کتب تحریر کی جا چکی ہیں لیکن اب تک عام لوگوں کے ذہنوں میں قیامِ امام حسین علیہ السلام کے ہدف و مقصد اور اس کے پیچھے کارفرما عوامل، اسباب و محرکات سے متعلق صحیح تصویر واضح نہیں ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے یہ قیام امت کو بخشوانے کے لئے سرانجام دیا، کوئی اسے دو شہزادوں کی جنگ قرار دیتا ہے تو کوئی اسے بغاوت کہتا ہے، بعض اسے دو خاندانوں کی جنگ تصور کرتے

ہیں تو کوئی اُسے تقدیر کا مسئلہ گردانتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر چہ کچھ مصنفین نے اس قیام کی مثبت تفاسیر بھی کی ہیں لیکن ان میں بہت سی تفاسیر ادھوری ہیں یا کسی خاص جہت پر مبنی ہیں لہٰذا اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام کو واضح طور پر بیان کیا جائے اور اس تفسیر کو اپنی زندگی کا نصب العین اور لائحۂ عمل قرار دیا جائے کیونکہ امام حسین علیہ السلام کی ذاتِ اطہر ہمارے لئے نمونۂ عمل ہے۔

زیرِ نظر کتاب استاد سید جواد نقوی کی عشرۂ محرم میں پڑھی جانے والی مجالس پر مشتمل ہے۔ آپ نے اس کتاب میں فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام پر تحقیق وتشریح کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جس میں قیامِ عاشوراء کے محرکات اور مقاصد کے بارے میں جتنے معروف نظریات تھے انہیں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعض نظریات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے اور آخر میں مقصد امام حسین علیہ السلام کو تجزیہ وتحلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف نے متعدد عناوین کے تحت مفصل گفتگو کی ہے جو تدریجاً کتابی شکل میں قارئین تک پہنچتی رہے گی۔ یہ سلسلہ مباحث چونکہ عام طبقات کے لئے ہے اس بنا پر ممکن ہے بعض پہلوؤں میں کمی رہ گئی ہو لہٰذا خطاؤں، غلطیوں اور کمیوں وکمزوریوں کی بابت پیشگی عذر قبول فرمائیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس کتاب سے بھرپور مستفید ہوں گے۔

متاب پبلیکیشنز

فہرستِ مطالب

پہلی فصل: 08

فلسفۂ قیام جاننے کی ضرورت اور منابع

موضوعِ فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام سے مراد 09

کربلا کو تفسیر کی ضرورت 10

◂◂ کربلا، آیتِ الٰہی 10

◂◂ تاریخِ قیام 10

فلسفۂ قیام امام حسین علیہ السلام سمجھنے کیلئے منبعِ اول ⇦ تاریخ 11

◂◂ صحیح تاریخ بیان کرنے کی ضرورت 12

◂◂ اجرت وانعام میں فرق اور بیانِ تاریخ کا صحیح انداز 13

◂◂ تفسیرِ کربلا کیلئے صحیح تاریخ کے مطالعے کی ضرورت 14

تاریخ فہمی کے قرآنی اصول 15

◂◂ علمِ فہمِ تاریخ 15

◂◂ قرآنِ کریم، تاریخ فہمی کا اولین منبع 15

تونگری میں گدایانہ روش! 17

تاریخ اور قصّے، کہانیوں میں فرق 18

◄◄ فلسفۂ تاریخ	18
تاریخ اور افسانہ میں فرق	19
◄◄ انسان کے لئے فکری مزاحمت	20
قیامِ امام حسین علیہ السلام کا پیش منظر اور پسِ منظر	22
تفسیرِ قیامِ امام حسین علیہ السلام کیلئے تاریخ کے ناکافی ہونے کی دلیلیں:	23
◄◄ پہلی دلیل ⇦ تاریخ نویسی کا باقاعدہ اہتمام نہ ہونا	23
◄◄ دوسری دلیل ⇦ بنی امیہ کا تاریخ پر تسلط	24
◄◄ تیسری دلیل ⇦ مورّخ کی ناتوانی	24
◄◄ چوتھی دلیل ⇦ مورّخ کی ذہنیت کا اثر	25
نظریات حقائق کے بجائے نظر پر استوار ہوتے ہیں	26
فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام سمجھنے کیلئے منبعِ دوم ⇦ بصیرت:	26
◄◄ حقیقت کو ایسے دیکھنا جیسی وہ ہے	27
◄◄ بصیرت پر ظلمات کے اندھیرے	28
◄◄ نورِ کربلا کے سامنے ظلمانی پردے	29
فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام سمجھنے کیلئے منبعِ سوم ⇦ کربلا کا ماحول:	32
◄◄ کربلا تک احساس کے ذریعے رسائی	33
◄◄ کربلا جانے سے مراد؟	35

- سیّار ریڑھی بانوں کے ساتھ کربلا نہ جائیں 36
- کربلا کے ساتھ رابطوں کی نوعیت 37
- عقیدت کا رابطہ 37
- روحِ کربلا سے رابطہ 37
- احساساتی اور روحانی رابطوں میں فرق 39
- ظاہری ملاپ اور روحانی ملاپ کا فرق 40
- احساساتی اور جذباتی حالتیں وقتی ہیں 41
- کربلا کا احساساتی پہلو 42
- کربلا اسوہ ہے 43
- ہر ایک کی الگ کربلا 45
- چھوٹے انسان کی کائنات بھی چھوٹی 45
- انسان کی غرضِ خلقت 48
- شرحِ صدر اور انتخابِ احسن 50
- شرحِ صدر، قرآنی تمغہ 50
- شرحِ صدر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا 51
- شرحِ صدر، ہدایت پانے کا اصول 54

دوسری فصل: 56

قیام امام حسین علیہ السلام کی تفسیر میں دشواریاں

◄◄ مختلف آراء اور نظریات 57

◄◄ عامۃ الناس سے مربوط ہونا 58

تیسری فصل: 64

قیام سید الشہداء علیہ السلام کی مختلف تفاسیر

۱۔ مطالبۂ بیعت 65

۲۔ اہل کوفہ کی دعوت 68

۳۔ تقدیر اور قسمت 70

۴۔ شہادت اور لقاء اللہ 73

۵۔ حصولِ اقتدار 76

۶۔ فلاحی اور رفاہی اصلاح 78

۷۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر 79

۸۔ امت کے گناہ بخشوانا 83

۹۔ بنی امیہ کا قیام 85

۱۰۔ خلافت کو بچانا 87

۱۱۔شیعہ کشی کی روک تھام	91
۱۲۔آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار کو بچانا	98
۱۳۔بدعتوں کو مٹانا	100
۱۴۔وظیفہ شرعیہ پر عمل پیرا ہونا	104
۱۵۔اتمام حجت	106
۱۶۔دینِ خدا کی حفاظت	115
۱۷۔زیادہ سے زیادہ ثواب دلوانا	116
۱۸۔حالات کا صحیح اندازہ نہ لگانا	118
۱۹۔طبقاتی جنگ	121
الف: قبائلی جنگ	121
ب: تاریخی تضاد اور ٹکراؤ	124
۲۰۔مزاج کی تندی	126
چوتھی فصل:	129
صحیح تفسیر کی ضرورت اور اس کا معیار	
اہم نکات	130
◂◂ پہلا نکتہ ⇦ تفاسیر کا نامکمل اور قابل اصلاح ہونا	130

- دوسرا نکتہ ⇦ صحیح تفسیر کی ضرورت 131
- تیسرا نکتہ ⇦ صحیح تفسیر کرنے کا معیار 132
- چوتھا نکتہ ⇦ صحیح تفسیر کے ضوابط 138

پانچویں فصل: 140

امام حسین علیہ السلام کا جامع المقاصد قیام

جامع المقاصد قیام 141

- معارف کی تشنگی پیدا کریں 142
- حضرت امام حسین علیہ السلام، واقعۂ کربلا کے بہترین مفسر 144

الف: وراثت انبیاءؑ کے تقاضے 145

- بنیادی مشکل کی وضاحت 147
- بے حسی کا سرچشمہ 151
- چھوٹی عادت، تناور خصلت کا پیش خیمہ 152
- مولا علی علیہ السلام کی نظر میں چھوٹے حقوق کی اہمیت 154
- بے حسی کی انتہا اور انجام 157
- اقوام کی بے حسی، انبیاء علیہم السلام کی راہ میں بڑی رکاوٹ 157
- واقعۂ غدیر کی فراموشی، بے حسی کا نتیجہ 159

◄◄ مولا علی علیہ السلام، بے حسوں کے درمیان 161

◄◄ بے حسی سب سے بڑا درد 163

◄◄ فلسفۂ قیام، بے حسی کا خاتمہ 169

◄◄ مکتبِ حسین علیہ السلام مکتبِ حکومتِ حق ہے 171

◄◄ فلسفۂ قیام بزبانِ امام علیہ السلام 172

◄◄ قیامِ امام حسین علیہ السلام، احساس کے ساکن سمندر میں تلاطم 175

ب: امامت کے تقاضے 177

◄◄ شیعت، ولایت کا مذہب ہے 179

◄◄ امام اور امامت دونوں کی معرفت ضروری ہے 181

◄◄ لفظِ امام کی وضاحت 188

◄◄ امام، محافظِ اقدارِ دین 189

ج: امام حسین علیہ السلام اسوہ ہیں 195

◄◄ حرکت کی تعریف 197

◄◄ جامد معاشرہ جوہڑ کی شبیہ 198

◄◄ امام حسین علیہ السلام جمود شکن 201

◄◄ تحریکِ کربلا، کبھی نہ رکنے والی تحریک 202

فہرستیں 204

پہلی فصل:

فلسفۂ قیام جاننے کی ضرورت اور منابع

موضوعِ فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام سے مراد

فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام ایک لحاظ سے بہت ہی محدود اور مقیّد موضوع ہے اور ایک جہت سے بہت ہی وسیع، عمیق اور گہرا عنوان ہے۔ محدود اس لحاظ سے ہے کہ حادثہ کربلا کے دامن میں اور بھی بہت کچھ ہے لیکن ہر وہ چیز جو کربلا اور قیامِ امام حسین علیہ السلام سے تعلق رکھتی ہے اس موضوع میں شامل نہیں ہے جیسے تاریخ کربلا، حوادث اور رونما ہونے والے دیگر واقعات کا ذکر بھی اس موضوع میں شامل نہیں ہے اور نہ ہی واقعۂ کربلا کے نتائج اس موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح بہت سارے کردار اور شخصیات اپنی جگہ پر بہت ہی اہم موضوعات ہیں۔ فلسفۂ قیام امام حسین علیہ السلام ان تمام موضوعات سے ہٹ کر ایک منفرد موضوع ہے جو بہت ہی وسیع اور عمیق ہے۔ لہٰذا پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ موضوع کیا ہے؟ تاکہ ہماری توقعات اتنی ہی رہیں جتنی اس موضوع سے رکھی جا سکتی ہیں۔ ممکن ہے ذہن میں آئے کہ فلسفہ قیام سے مراد فلسفہ بیان کرنا ہے جیسا کہ علمِ منطق ہے جو علمی مراکز میں پڑھایا جاتا ہے لیکن یہاں پر مقصود علم فلسفہ بیان کرنا نہیں ہے، فلسفی نظریات کا نام فلسفۂ کربلا یا فلسفۂ عاشورا نہیں ہے۔

فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام سے مقصود یہ ہے کہ یہ قیام کن مقاصد کے حصول کے لیے برپا ہوا، اس کے پیچھے کارفرما عوامل، اسباب اور محرکات کیا تھے؟ اور اس قیام کے دوران جو کچھ رونما ہوا اس کا ان مقاصد سے کیا تعلق تھا؟

کربلا کو تفسیر کی ضرورت

کربلا، آیتِ الٰھی

حقیقت میں حادثہ کربلا ایک آیت الٰہی ہے لہٰذا جس طرح سے آیت قرآنی کی تفسیر کی ضرورت ہے اسی طرح اس عظیم حادثہ کی بھی تفسیر کی ضرورت ہے۔ قرآنی آیت کی ایک تاریخ ہوتی ہے کہ یہ آیت کب نازل ہوئی، کہاں نازل ہوئی، کس کی شان میں نازل ہوئی؟ اسی طرح قرآنی آیات کی ایک تفسیر ہوتی ہے کہ جس کے تحت علماء ان آیات کے معانی اور مقاصد واضح کر دیتے ہیں۔ اسی طرح واقعۂ کربلا کی ایک تاریخ ہے کہ یہ واقعہ کب پیش آیا؟ کیسے واقع ہوا؟ کہاں واقع ہوا؟ اور ایک اس کی تفسیر ہے کہ کیوں اور کن مقاصد کے لیے یہ واقعہ رونما ہوا؟ نیز یہ کہ اس کا عالم بشریت کے لیے کیا پیغام ہے؟ اس کیوں کا جواب دینا مشکل ہے اور یہی فلسفۂ قیام بھی ہے۔ کربلا ایک ایسی آیت الٰہی ہے جو محتاجِ تفسیر ہے لہٰذا مفسرین نے اس کی مختلف تفسیریں بھی کی ہیں۔ جب تک واقعات کی تفسیر بیان نہ ہو تو ممکن نہیں کہ ہم ان کے حقیقی اسباب اور مقاصد تک پہنچ سکیں۔

تاریخِ قیام

بظاہر زمانے کے لحاظ سے یہ واقعہ بہت ہی چھوٹے سے وقت سے تعلق رکھتا ہے یعنی بہت مختصر زمانے میں یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد بھی کئی جنگیں لڑی گئیں جو کئی کئی برسوں تک جاری رہی ہیں یہاں تک کہ بعض عرب قبائل کے درمیان چالیس سال تک جنگیں جاری رہی ہیں جبکہ واقعہ کربلا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بظاہر ایک دن کی جنگ ہے جو دن کے اولین حصے میں شروع

ہوئی اور نصف دن گزرنے تک اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ تفسیر کے لئے ان چالیس سالہ جنگوں کے اندر اتنا مواد موجود نہیں ہے کہ انسان ان پر چالیس منٹ بھی گفتگو کر سکے اگرچہ تاریخ میں موجود جنگوں پر بڑی بڑی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن چالیس منٹ کی گفتگو کا مواد ان چالیس سالہ جنگوں کے اندر موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس چند گھنٹوں کی اس جنگ کے اندر اتنا مواد ہے کہ اگر انسان چالیس سال بھی بیان کرتا رہے تو بھی اس کی تفسیر انتہا کو نہیں پہنچتی۔ جس طرح سے قرآنی آیات کی تفسیریں انتہا کو نہیں پہنچتیں اسی طرح کربلائی آیات کی تفسیریں بھی بیان کرتے کرتے ختم نہیں ہوتیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود سب سے پہلے قیام امام حسین علیہ السلام کی تفسیر کے لیے منابع کی ضرورت ہے۔

فلسفۂ قیام امام حسین علیہ السلام سمجھنے کیلئے منبعِ اول ⇦ تاریخ

عام طور پر قیام امام حسین علیہ السلام کی تفسیر کے لیے جو منبع پیش کیا جاتا ہے وہ تاریخ ہے جبکہ تفسیر سے مقصود تاریخ نقل کرنا نہیں ہوتا اگرچہ کربلا کی صحیح تاریخ بھی بیان ہونی چاہیے اور فلسفۂ کربلا سمجھنے سے پہلے تاریخ کربلا معلوم ہونا اشد ضروری ہے۔ جب تک ہم صحیح تاریخ سے آشنا نہ ہوں یہ تفسیر کا مرحلہ آسان نہیں، یوں نہیں کہ جو بھی کربلا کے ذکر کے طور پر بیان کیا جاتا ہے وہ حقیقتِ کربلا بھی ہے۔

صحیح تاریخ بیان کرنے کی ضرورت

اگر ہم حقیقتِ کربلا کو سمجھنا چاہتے ہیں تو فلسفۂ کربلا کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ ہم یہ یقین کرلیں کہ ہماری اس واقعہ کے بارے میں معلومات واطلاعات بہت کم ہیں اور وہ بھی کسی حد تک صحیح اور کس حد تک غلط ہیں، لہٰذا سب سے پہلے کربلا کو ایک صحیح تاریخ کی ضرورت ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ تاریخ کربلا بھی صحیح طریقے سے بیان نہیں کی جاتی اور اس کی دلیل بھی بہت واضح ہے، اس لیے کہ ایسے لوگوں نے کربلا کو بیان کرنا شروع کر دیا جن کا کربلا سے کوئی ربط ہی نہیں۔

مثلاً ایک ماں ہے اور ایک دایہ، ماں وہ ہے کہ جس کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور دایہ وہ عورت ہے جس کو اجرت دی جاتی ہے کہ وہ آ کر بچے کو نہلائے، دھلائے۔ یہ عورت بھی بچے کا بہت خیال رکھتی ہے لیکن سب کچھ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اجرت لیتی ہے، ماں بھی بچے کے لیے سب کچھ کرتی ہے لیکن ماں کسی سے اجرت کی توقع نہیں رکھتی لہٰذا ایک ہی بچے کے لیے دو آغوشیں ہو سکتی ہیں۔ ایک اجرت کی گود ہے اور دوسری ماں کی گود ہے لیکن اجرت والی گود روتے ہوئے بچے کو کبھی بھی مامتا کی طرح پیار نہیں دے سکتی کیونکہ ماں اگر مریض بھی ہو اور حرکت کی سکت بھی نہ رکھتی ہو تو بھی وہ بچے کی مصیبت دیکھ کر اپنے مرض کو بھول جاتی ہے، لہٰذا جو اجرت پر بچے سنبھالتی ہیں ان کی نظر میں بچوں کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ فقط اجرت اور مزدوری ان کی نظر میں مہم ہوتی ہے اور جب کبھی ان عورتوں سے کہا جائے کہ بچوں کو لوریاں اور کہانیاں سناؤ تاکہ یہ آرام سے سو جائیں تو یہ عورتیں اجرت لے کر کبھی سچے اور کبھی جھوٹے اور من گھڑت قصے سنا سنا کر بچوں کو سلا دیتی ہیں لہٰذا ہم بھی بعض لوگوں کو پیسہ دیتے ہیں کہ وہ آئیں اور ہمارے لئے واقعۂ کربلا بیان کریں، وہ لوگ بھی اُجرت لے کر قوم کو لوریاں سنا سنا کر سلا دیتے ہیں۔

اجرت و انعام میں فرق اور بیانِ تاریخ کا صحیح انداز

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ائمہ اطہار علیہم السلام بھی تو ایسا ہی کرتے تھے کہ کسی شاعر کو بلاتے تھے اور وہ آکر واقعہ کربلا بیان کیا کرتا تھا، خود بھی روتا تھا اور دوسروں کو بھی رُلاتا تھا پھر آخر میں ائمہ علیہم السلام ان کو انعامات وغیرہ سے نوازتے تھے لہٰذا ہم بھی یہی کام کرتے ہیں۔ یہ عجیب اجتہاد ہے، اب تک کسی فقیہ اور مجتہد کہ جس نے اپنی پوری عمر استنباط و اجتہاد کے لیے وقف کر دی ہے وہ بھی اس طریقے سے حکم شرعی کو استنباط نہیں کرتا۔ دیکھیے جب ڈور کا سِرا گم ہو جائے تو انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

ائمہ علیہم السلام یوں نہیں کرتے تھے کہ بعض اشخاص کو اجیر بناتے تا کہ وہ اُجرت لے کر واقعہ کربلا بیان کریں بلکہ وہ لوگ اپنا فریضہ سمجھ کر واقعاتِ کربلا کو اس طرح سے بیان کرتے تھے کہ لوگوں کے سامنے کربلا کو مجسم کر دیتے تھے اور حقیقت کربلا لوگوں کے سامنے کُھل کر واضح ہو جاتی تھی۔ ائمہ معصومین علیہم السلام بھی ان کو اُجرت نہیں دیتے تھے اور مصائب پڑھنے والے بھی کسی لالچ کی خاطر نہیں پڑھتے تھے چونکہ اس کام کی کوئی اُجرت نہیں بنتی مثلاً دعبل خزاعی نامی شاعر کو دیکھیے کہ جب وہ واقعاتِ کربلا بیان کرتے تھے تو اس طرح سے کہ سلاطین کے دربار لرز جاتے تھے اور امام علیہ السلام بھی لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کہ یہ وہ کام ہے جو سب کو کرنا چاہیے کبھی ان کو خِلعَت اور کبھی انعام دیتے تھے۔

اُجرت، انعام اور خلعت میں بڑا فرق ہے۔ جو اجرت لے کر واقعاتِ کربلا بیان کرتے ہیں وہ جب تک ٹائم پورا نہیں ہوتا اس وقت تک واقعات بیان کرتے رہتے ہیں، بسا اوقات پوچھتے بھی ہیں کہ کتنے منٹ باقی ہیں؟ یہ اجیر کہاں اور مقام دعبل خزاعی کہاں؟ دعبل خزاعی وہ تھا جو یہ کہتا تھا کہ میں پھانسی کا پھندا اپنے دوش پر لے کر چل رہا ہوں۔ جن لوگوں کو ہم اجرت دے کر بلاتے ہیں، جو کچھ بھی

ان کے ذہن میں آتا ہے وہ بیان کر دیتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ وہ تاریخِ کربلا بن جاتی ہے۔ لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کربلا ہمارے ہاں صحیح طریقے سے بیان نہیں کی جاتی۔ تعجب تو یہ ہے کہ جس نے تاریخ کی ایک کتاب بھی پوری زندگی میں نہیں پڑھی ہے وہ ہمارے لیے تاریخ کربلا بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔

◄◄ تفسیرِ کربلا کیلئے صحیح تاریخ کے مطالعے کی ضرورت

آپ یقین جان لیں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے پوری زندگی میں بہت کچھ پڑھا ہے، ڈائجسٹ پڑھے ہیں، کئی اخباری کالم، میگزین اور مجلّے وغیرہ پڑھے ہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ پڑھا ہوگا لیکن تنہا چیز جو انہوں نے نہیں پڑھی وہ یہ ہے کہ کربلا کے متعلق ایک بھی معتبر کتاب نہیں پڑھی۔ یہ ان کا قصور نہیں ہے بلکہ سننے والے بھی ایسے ہوتے ہیں، زندگی میں بہت کچھ پڑھا ہوگا، صفحے کے صفحے پڑھ دیئے ہوں گے، اپنے سلیبس (Syllabus) کی کتابیں، مربوط و نامربوط لٹریچر، مجلّے سب پڑھ دیئے ہوں گے لیکن تنہا وہ چیز جس پر چند صفحے بھی نہیں پڑھے وہ یہی ہے کہ جس کے بارے میں ہم کہتے ہیں یہ ہماری رگِ حیات ہے۔ عینِ دین اور عینِ اسلام ہے۔ لہٰذا ہمارے سننے والے اور بیان کرنے والے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں لیکن بہت ہی قلیل اہلِ علم بھی ہیں کہ جنہوں نے محنت کر کے صحیح تاریخ بیان کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حقیقتِ کربلا کو بیان کرنے کے لیے صحیح تاریخ کے مطالعے کی اشد ضرورت ہے اگرچہ یہ کام ابھی تک صحیح طریقے سے نہیں ہو رہا ہے لیکن پھر بھی فقط تاریخ بیان کرنے سے انسان حقیقتِ حادثہ عاشورا تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دیگر منابع کی بھی ضرورت ہے۔

تاریخ فہمی کے قرآنی اصول

علمِ فہمِ تاریخ

تاریخ پڑھنے سے پہلے ایک اور علم کی ضرورت ہے، خواہ وہ مدوّن علم ہو یا انسان کا فطری علم ہو۔انسان کے لیے بعض علوم فطری ہیں جو کہ بعد میں تدوین ہوئے ہیں جیسے علم منطق کو ارسطو نے تدوین کیا لیکن ارسطو سے پہلے بھی لوگ علم منطق جانتے تھے، اس لیے کہ یہ ایک فطری علم ہے۔جبکہ بعض دوسرے علوم انسان کے لیے غیر فطری ہیں جنہیں انسان سیکھتا ہے اور کوئی دوسرا ان کی تدوین کرتا ہے۔تدوین سے پہلے کوئی بھی اس علم کو نہیں جانتا۔لہٰذا علم تاریخ کو سمجھنے کے لیے ایک دیگر علم کی ضرورت ہے جو فطری علم ہے اور اس کا نام علمِ فہمِ تاریخ ہے۔

اس فطری علم کو بعد میں لوگوں نے مرتب و منظّم کر کے پیش کیا اگر چہ اس میں اختلاف ہے کہ اس فطری علم کا سب سے پہلا مدوّن کون تھا؟ یعنی کس نے سب سے پہلے اس علم کے بارے میں قواعد و ضوابط جمع کر کے پیش کیے۔مسلمان کہتے ہیں کہ علم فہم تاریخ کا اوّلین مدوّن ابن خلدون ہے یعنی ابن خلدون نے سب سے پہلے تاریخ سمجھنے کا ڈھنگ سکھایا اور تاریخ کو افسانہ سازی سے جُدا کیا اور کچھ اس کی نسبت دوسروں کی طرف دیتے ہیں۔

قرآنِ کریم،تاریخ فہمی کا اولین منبع

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ سمجھنے کا ڈھنگ سب سے پہلے قرآن کریم نے سکھایا ہے اور ابن خلدون نے قرآن سے الہام لیا ہے۔قرآن کا اکثر حصہ تاریخ سے مربوط ہے۔قرآن نے تاریخ

ذکر کرنے سے پہلے تاریخ سمجھنے کا انداز اور ڈھنگ سکھایا ہے اور فرمایا کہ جو سنن، روایات اور قوانین آپ سے پہلے والی امتوں کے لئے تھے وہ آپ پر بھی حاکم ہیں یعنی اس سے پہلے کہ قرآن کریم یہ بتائے کہ قومِ ثمود، قومِ عاد وغیرہ کے ساتھ خدا نے کیا کیا، پہلے یہ بتاتا ہے کہ ان کے ہاں رائج قوانین کیا تھے اور ان ہی طور طریقوں کی وجہ سے ہم نے ان کو ہلاک کیا، اگر کسی قوم کی ترقی کا ذکر کیا ہے تو پہلے یہ بتایا کہ ترقی کے اصول کیا ہیں؟ اور یہ اصول زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ نہیں بدلتے اگرچہ ترقی کی نوعیت اور شکل بدل جاتی ہے۔ لہٰذا پہلے ان اصولوں اور قوانین کا ذکر کیا ہے پھر بتایا کہ یہ قومیں زوال کا شکار ہوئیں اور یہ قومیں عروج پر پہنچیں، ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ تم بھی ان ہی جیسے ہو اور وہی قوانین اور اصول تمہارے بارے میں بھی ہیں، فرمایا:

وَاِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِکَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا...... [1]

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پرستوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس بستی میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں......

اور وہ بھی فسق و فجور کو انتہا تک پہنچاتے ہیں تو پھر اس کے بعد ہماری باری آتی ہے،

فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْرًا ۝

تب اس بستی پر فیصلۂ عذاب لازم ہو جاتا ہے، پھر ہم اسے پوری طرح تباہ کر دیتے ہیں۔ ہم اس قوم کو مسل دیتے ہیں حتیٰ کہ اس کا نام و نشان تک مٹا دیتے ہیں۔ بعض قومیں نشان کے

---

[1] ......سورۂ اسراء، آیہ ۱۶

طور پر اپنے پیچھے قبریں چھوڑ جاتی ہیں لیکن خدا جن قوموں کو نیست و نابود کرے ان کی قبروں کے نشان بھی مٹ جاتے ہیں، عاد و ثمود کہاں دفن ہوئے اس کا کوئی نام و نشان موجود نہیں ہے؟

یہ قرآن کے ثابت اصول ہیں، لہٰذا تاریخ پڑھنے سے پہلے ان اصولوں کو دیکھنا چاہیے، پھر تاریخ کے آئینے میں اپنا مستقبل دیکھنا چاہیے تا کہ اس تاریخی آئینے میں آپ کو اپنا مستقبل نظر آئے۔

تونگری میں گدایانہ روش!

فلسفۂ تاریخ کو سمجھنے کے لیے قرآن مجید نے سنہری اصول ذکر کر دیئے ہیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے پھر بھی کاسۂ گدائی لے کر دوسروں کے دروازوں پر جا رہے ہیں، اگر نادار و فقیر لوگ کاسۂ گدائی لے کر دوسروں کے دروازوں پر جا کر مانگتے ہیں تو یہ اتنے تعجب کی بات نہیں ہے لیکن اگر اغنیاء اور بڑے بڑے سرمایہ دار کشکول لے کر دوسروں کے در پر جائیں اور کہیں کہ اس میں کچھ ڈال دیں تو کیا یہ حماقت نہیں ہے؟!

سب سے بری گدائی، ثقافتی اور علمی گدائی ہے۔ جس کے پاس علم کے خزائن موجود ہوں تو کیا وہ علم کا کشکول گلے میں ڈال کر دوسروں کے در پر جاتا ہے اور التماس کرتا ہے کہ مجھے کچھ سمجھا دو؟ لہٰذا ہم کیوں ابن خلدون وغیرہ کے پیچھے چلے جائیں اور ان سے قرآن فہمی کے اصول سیکھیں؟ کیا قرآن کریم نے نہیں بتایا کہ تاریخ کیسے سمجھی جاتی ہے؟ کیا قرآن اور اہلبیت علیہم السلام کے ہوتے ہوئے بھی ہم دوسروں سے پوچھیں کہ تاریخ کیسے سمجھی جاتی ہے؟ یہ واقعاً حماقت ہے۔ واقعہ کربلا بھی چونکہ تاریخ کا ایک حصہ ہے لہٰذا کربلا کا تاریخی پہلو بھی ان اصولوں سے باہر نہیں ہے۔ کسی بھی تاریخی واقعہ کا تاریخی

پہلوان اصولوں سے باہر نہیں ہوسکتا خواہ وہ دردناک، المناک اور تلخ واقعہ ہو یا جشن وسرور کا واقعہ ہو جیسے واقعۂ غدیر۔ واقعۂ غدیر اور واقعۂ عاشورا دونوں ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں اگر عاشورا کسی کی سمجھ میں آجائے تو غدیر بھی سمجھ میں آجاتی ہے ورنہ جو عاشورا سے دور رہا وہ غدیر سے بھی دور ہی رہے گا۔

تاریخ اور قصّے، کہانیوں میں فرق

گذشتہ زمانے میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان کے تذکرہ کو عام طور پر تاریخ کہا جاتا ہے خواہ وہ کتابی شکل میں ہوں یا گفتگو کی شکل میں، حالانکہ یہ مفروضہ قصہ اور کہانی کے لئے ہے کیونکہ ماضی کے تذکروں کو قصہ کہا جاتا ہے جبکہ تاریخ ایک خاص چیز ہے، اگر انسان صرف یہ جاننے کی کوشش کرے کہ ماضی میں کیا ہوا تو اس کو کہانی کہا جاتا ہے چاہے اس کا مواد جیسا بھی ہو، اچھا ہو یا بُرا، دینی ہو یا غیر دینی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر انسان یہ بھی جان لے کہ ماضی میں کیا ہوا اور کس طرح ہوا تو یہ ایک لحاظ سے علم تاریخ ہو جائے گا نہ کہ خود تاریخ۔ تاریخ صرف ایک ماجرا ہے، صرف واقعہ ہے کہ کیا ہوا؟ جیسا کہ آپ اخبار میں روزمرہ کے حوادث پڑھتے ہیں کہ آج ملک کے فلاں خطہ میں یہ واقعہ رونما ہوا، اگر صرف اس پر اکتفا کیا جائے تو یہ کہانی اور قصہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر یہ بھی جاننے کی کوشش کی جائے کہ یہ سب کچھ کیوں رونما ہوا ہے تو یہ علم تاریخ ہے۔

فلسفۂ تاریخ

یہاں ایک تیسری چیز بھی ہے اور وہ یہ کہ انسان یہ بھی جاننے کی کوشش کرے کہ ماضی میں جو

کچھ رونما ہوا اس کا مستقبل سے کیا تعلق ہے؟ یعنی مستقبل میں اس سے کیا اخذ کیا جا سکتا ہے، تو اس صورت میں اس کا تعلق فلسفۂ تاریخ سے ہو جائے گا، لہٰذا بعض بزرگان کی تاریخ کے بارے میں تعبیر ہے کہ اگر تاریخی واقعات صرف یہ جاننے کے لیے ہوں کہ ماضی میں کیا ہوا تو یہ کہانی ہے لیکن اگر گذشتہ واقعات کے ذریعے سے انسان کے مستقبل کا راستہ تلاش کریں یعنی ماضی کے آئینہ میں اپنا مستقبل دیکھیں تو یہ فلسفۂ تاریخ ہے۔

قرآن کریم کا اکثر حصہ تاریخ ہے لیکن قرآن کی تاریخ قصہ نہیں ہے اس لیے کہ قرآن صرف یہ نہیں بتاتا کہ کیا واقع ہوا، لہٰذا جو کہانی کے اوصاف ہیں وہ قرآنی حکایات میں موجود نہیں ہیں۔ قرآن میں انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کا تذکرہ جگہ جگہ ہے لیکن کسی نبی کی تاریخ پیدائش، تاریخ ولادت اور انفرادی زندگی کا تذکرہ نہیں ہے۔ شادی کس سے ہوئی؟ کیسے ہوئی ان جیسی باتوں کا ذکر نہیں۔ اگرچہ یہ ساری باتیں تاریخ کا حصہ ہیں لیکن یہ ایسی باتیں ہیں کہ ان کے آئینہ میں مستقبل نظر نہیں آتا۔

تاریخ اور افسانہ میں فرق

قرآن کریم نے تاریخ کو ایک مستقبل نما آئینہ کے طور پر پیش کیا ہے لیکن انسان کا ذہن متخیّل ہے، اس تخیل کے نتیجے میں انسان یہ قدرت رکھتا ہے کہ تاریخ کو کہانی اور مستقبل کو افسانہ بنا لے کیونکہ انسان افسانہ سازی میں بہت ماہر ہے۔ لہٰذا جب قرآن نے تاریخ پیش کی، فلسفہ تاریخ پیش کیا اور ماضی کے آئینہ میں قوموں کو اپنا مستقبل دکھایا تو اس کو بھی یہی جواب ملا کہ

مَا هٰذَا اِلَّا أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ ۝ [1]

یہ تو بس اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

یہ تو وہی گزشتہ زمانوں کی کہانیاں ہیں، یہ تو ہم نے پڑھی ہوئی ہیں۔لہٰذا تاریخ فہمی کے مرحلے میں ایک بہت بڑی لغزش گاہ موجود ہے، اگر ہم تاریخ کو ایک بہتی ہوئی نہر فرض کریں تو اس کے ساحل پر ایک لغزش گاہ بھی ہے کہ جہاں انسان پھسل جاتا ہے، بجائے اس کے کہ اس نہر تاریخ میں کود جائے اور وہاں سے کچھ حاصل کرے وہ افسانہ کی گھاٹی میں گر جاتا ہے۔

انسان کے لئے فکری مزاحمت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ خیال سے نوازا ہے لیکن کبھی یہ قوت عمل اور فہم کے مرحلے میں مزاحم بن جاتی ہے۔قرآن کریم کی تعبیر ہے کہ انسان کدح کی حالت میں اللہ کی طرف گامزن ہے،

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيْهِ ۝ [2]

اے انسان! تو مشقت اٹھا کر یقیناً اپنے رب کی طرف جانے والا ہے پھر اس سے ملنے والا ہے۔

یعنی انسان زحمت و مشقت کی حالت میں اللہ کی طرف رواں دواں ہے۔ یہ زحمت انسان کو دو مقامات پر درپیش ہے، سمجھنے کے مرحلے میں انسان زحمت سے دوچار ہو جاتا ہے اور یہ قوت اسے صحیح فکر نہیں کرنے دیتی، اسی طرح پھر عمل کے مرحلے میں انسان کو یہی زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔لہٰذا اگر یہ قوت

---

[1] ۔۔۔۔۔سورۂ احقاف، آیہ ۱۷

[2] ۔۔۔۔۔سورۂ انشقاق آیہ ۶

تخیل تہذیب یافتہ، تربیت یافتہ نہ ہوتو بڑی مزاحم قوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن اسی قوت کی صحیح تربیت ہوتو یہ بہت بڑی تخلیقی قوت بن جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا ایک نمونہ تاریخ فہمی کا مرحلہ بھی ہے کہ جونہی انسان کسی تاریخی روئیداد میں داخل ہوتا ہے تو قوت خیال مزاحمت ایجاد کرتے ہوئے تاریخ کو افسانہ بنا دیتی ہے اور انسان محسوس تک نہیں کر پاتا کہ یہ تاریخ ہے یا افسانہ؟ بالآخر تاریخ کا اپنا ایک معیار ہے اور افسانے کا الگ معیار ہے۔ یہ قوتِ خیال ہمیشہ تاریخ سے اپنا مواد لیتی ہے چونکہ تاریخ بھی معرفت کے منابع میں سے ایک منبع ہے لیکن یہ الگ بات ہے کہ اس سے کون استفادہ کر رہا ہے؟

انسان کے فکری مزاحمت

انسان اگر قوتِ خیال تاریخ سے استفادہ کرنا شروع کرے تو پھر افسانے جنم لیتے ہیں، صدر اسلام کی تاریخ سے کتنے افسانے لکھے گئے ہیں، کتنی فلمیں بنائی گئی ہیں، کتنے سیریلز (Serials) بنائے گئے ہیں، ویسے بھی ہماری سرزمین میں افسانہ شناسی ایک عام سی بات ہے چونکہ ہمارا معاشرہ افسانہ زدہ ہے۔ ہم اگر یہ بات لکھ رہے ہیں تو اس کے کافی شواہد بھی موجود ہیں مثلاً آپ جا کر اپنی مطبوعات دیکھ لیں۔ جو سالانہ رپورٹ وزارتِ اطلاعات پیش کرتی ہے اور جو اعداد و شمار ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں کتنا علمی اور تحقیقی مواد اور کتنا خیالی اور افسانوی مواد چھپتا ہے۔ ڈائجسٹ اور ناولز کی قسم کے مواد بہت زیادہ چھپتے ہیں، اخبارات ہفت نامے، ماہنامے وغیرہ دیکھ لیں کہ ان کے اندر کتنی کہانیاں، ناول اور قصے ہوتے ہیں اور کس قدر تخلیقی مواد پایا جاتا ہے؟

قوتِ خیال کے اور بھی بہت سارے لوازمات ہیں، یہ تاریخ کے ساحل پر ایک بہت بڑی لغزش گاہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انسان شاعری اور افسانے کو تاریخ سمجھ بیٹھے یا تاریخ کو افسانہ سمجھنے لگے۔ افسانے اچھے بھی ہوتے ہیں کیونکہ کبھی کبھی افسانوں میں اچھی باتیں بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔

قیامِ امام حسین علیہ السلام کا پیش منظر اور پسِ منظر

حادثہ کربلا اتنا عمیق ہے کہ سالہا سال بلکہ صدہا سال بھی اگر اس کے بارے میں گفتگو اور بحث وجستجو کی جائے تو بھی شاید اس کی حقیقت اور عمق تک نہ پہنچ سکیں۔ آج کئی سو سال کی تحقیق وجستجو کے بعد بھی واقعۂ کربلا انسان کے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے اور انسان اس کی وسعتوں کو نہیں پا سکا۔ وجہ یہ ہے کہ معاشرے کے اس میدان میں جو بشری واقعات رونما ہوتے ہیں ان کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو روئے منظر ہے اور دوسرا پہلو ان کا پس منظر ہے، ممکن ہے کہ روئے منظر میں چند گھنٹے لگیں لیکن شاید پس منظر کو بیان کرتے ہوئے صدیاں لگ جائیں اور پھر بھی انسان اس پر احاطہ نہ کر سکے! یہ حیرت اور سرگردانی صرف ہمارے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، جتنا مذہبِ امامیہ نے اس کے بارے میں سوچا ہے اتنا ہی مذاہبِ غیر امامیہ نے بھی سوچا ہے بلکہ جس قدر مسلمانوں نے اس کے بارے میں گفتگو کی ہے اتنی ہی دوسروں نے بھی کی ہے لیکن اس کے باوجود انسان بحرِ کربلا کے ساحل تک پہنچا ہے۔

بعض لوگوں نے اس حادثے کا صرف تاریخی حیثیت سے تجزیہ وتحلیل کیا ہے، روایات و حکایات کے اندر اس کے تاریخی عوامل اور اسباب کی جستجو کی ہے کیونکہ یہ واقعہ تاریخ کا حصہ بھی ہے، لہٰذا انہوں نے تاریخ میں جھانک کر اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن واقعۂ کربلا کی حقیقت تک پہنچنے کیلئے تاریخ کافی نہیں ہے اور اس مدعا کے لئے کافی دلائل موجود ہیں۔

تفسیرِ قیامِ امام حسین علیہ السلام کیلئے تاریخ کے ناکافی ہونے کی دلیلیں:

◄◄ پہلی دلیل ⇦ تاریخ نویسی کا باقاعدہ اہتمام نہ ہونا

واقعۂ کربلا جس زمانے میں رونما ہوا اس زمانے میں تاریخ نویسی باقاعدہ ایک فن نہیں تھا جیسا کہ آج ہے۔آج خبر نگاری، روزنامہ نگاری، تاریخ نگاری باقاعدہ ایک فن اور پیشہ بن چکا ہے۔ایسے ادارے موجود ہیں کہ جنہوں نے اس فن کو سنبھالا ہوا ہے، ان اداروں میں پیشہ ور لوگ اجرت لے کر یا بغیر اجرت کے شوقیہ طور پر وقائع وحالات اور حوادث کو قلم بند کرتے ہیں۔آج کل اگر کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی کسی دور افتادہ دیہات میں واقع ہوتا ہے تو کئی اخباروں کے نمائندے خبر نگاری اور واقعہ نگاری کے لیے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔اب صحیح قلم بند کرتے ہیں یا نہیں یہ ایک الگ بات ہے لیکن اس زمانے میں ایک اہتمام بحرحال موجود ہے۔

پہلی دلیل ⇦ تاریخ نویسی کا باقاعدہ اہتمام نہ ہونا

لیکن جب واقعۂ کربلا رونما ہوا اس زمانے میں باقاعدہ طور پر ایسا کوئی اہتمام نہیں تھا، البتہ کچھ لوگ ایسے تھے کہ جن کو مأمور کیا جاتا تھا کہ وہ واقعہ کی تفصیل بیان کریں تاکہ اپنے بڑے افسران تک پہنچایا جاسکے لہٰذا وہ بھی ہر چیز نہیں لکھتے تھے بلکہ صرف وہی واقعات لکھتے تھے کہ جن کے بارے میں انہیں کہا جاتا تھا کہ یہ لکھ کر ہم تک پہنچادو! وہ تاریخ نہیں لکھتے تھے بلکہ ایک رپورٹ تیار کرتے تھے تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہوجائے جبکہ تاریخ نگاری ایک الگ چیز ہے۔تاریخ کے اندر جو واقعات قلم بند ہیں اور وہ بھی اس زمانے کی تاریخ کے کہ جس میں تاریخ نگاری کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا ان میں بھی ردوبدل واقع ہوا ہے لہٰذا موجودہ تاریخ بغیر کسی خاص انتظام واہتمام کے وجود میں آئی ہے۔

دوسری دلیل ⇦ بنی امیہ کا تاریخ پر تسلط

کربلا کی تاریخ ایسے زمانے میں لکھی گئی کہ جس میں بنی امیہ کا دور دورہ تھا۔ بنی امیہ اپنے آپ کو فاتح سمجھ کر پوری سلطنتِ اسلامیہ پر قابض تھے۔ آج بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ فوجی حکومت میں جب اخبار چھپتے ہیں تو باقاعدہ فوجی ذہنیت، سوچ اور طرزِ تفکّر روزناموں اور اخباروں میں نظر آتا ہے حالانکہ کہتے بھی ہیں کہ میڈیا آزاد ہے، جبکہ بنوامیہ کے زمانے میں خبر نگاری آزاد نہیں تھی، اس لئے تاریخ پر بنی امیہ کا طرزِ تفکر حاکم ہے، لہٰذا جب بنی امیہ کی نگرانی اور نظارت میں تاریخ لکھوائی گئی تو پھر یہ تاریخ سو فیصد کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟ پس سب سے پہلے ضرورت ہے کہ حادثہ کربلا کی تاریخ میں، دوبارہ تحقیق کی جائے، جو کچھ تاریخ میں لکھا ہوا ہے اس کو سربستہ قبول نہ کریں بلکہ علماء و محققین کو چاہئے کہ وہ تاریخی کتب میں بحث و جستجو کریں، ان میں جو غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی کریں اور لوگوں کے سامنے حقائق پیش کرنے کی کوشش کریں۔

تیسری دلیل ⇦ مورّخ کی ناتوانی

اگر ہم صرف تاریخی پہلو کو دیکھیں تو تاریخ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ سارے واقعات کو اپنے اندر سمیٹ کر دوسروں تک منتقل کر سکے۔ جب ایک واقعہ رونما ہوتا ہے تو بہت ساری چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو قلم میں نہیں آسکتیں، اس لیے کہ تاریخ نگار کی دید میں کچھ چیزیں نہیں آتیں، تاریخ نگار وہی منظر دیکھ کر تاریخ نگاری کرتا ہے جو منظر اس کی ظاہری دید میں آتا ہے۔ وہ جو دیکھتا ہے اور اس کو قلم بند کر دیتا ہے لیکن اس واقعہ کے پیچھے کارفرما عوامل، محرکات اور علل و اسباب اس کی دید سے باہر ہوتے ہیں لہٰذ

ان سب کو چھوڑ کر تاریخ لکھ دیتا ہے۔

مثلاً کوئی خبر نگار یا مؤرخ امریکا اور عراق کی جنگ کو صفحۂ تاریخ پر لکھتا ہے تو لکھے گا کہ فلاں تاریخ کو امریکا نے عراق پر حملہ کیا، اتنے دنوں میں بغداد پر قابض ہوا اور اتنے دنوں میں صدام کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، لیکن اس جنگ کے پیچھے کیا عوامل کارفرما تھے؟ یہ جنگ کیوں واقع ہوئی؟ اس جنگ میں امریکہ کے مقاصد کیا تھے یہ سب ایسے حقائق ہیں جو تجزیہ و تحلیل کے محتاج ہیں۔ یہ ظاہر میں نظر آنے والی چیزیں نہیں ہیں بلکہ ظاہر میں جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں وہ بہت ہی دلپسند ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ہم نے عراقی عوام کو آزادی دلائی ہے، یہ جمہوریت کی جنگ ہے، ہم دنیا میں عدل وانصاف قائم کر کے جمہوریت برپا کرتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ روئے منظر ہے۔ پس منظر اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔

◄◄ چوتھی دلیل ⇦ مورّخ کی ذہنیت کا اثر

ہر مورّخ کی دید اور بصر دوسرے مورّخ سے جدا ہوتی ہے، ایک ہی حقیقت ایک مورّخ کو الگ طرح سے نظر آتی ہے جبکہ وہی حقیقت ایک دوسرے مورخ کو کسی اور رنگ میں نظر آتی ہے۔ مورخ کو جو کچھ نظر آتا ہے صرف وہی لکھتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اسے جو کچھ دکھائی دے رہا ہے تمام واقعہ وہی ہو۔ ممکن ہے اس حادثہ کے وقوع پذیر ہونے میں اور بھی بہت سی چیزیں دخیل ہوں کیونکہ واقعات میں اور بھی بہت سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ مہم یہ ہے کہ دیکھنے والا کس نظر اور کس ذہنیت سے دیکھ رہا ہے؟ آیا اس کی نظر کمزور ہے؟ آیا کسی عینک کے ساتھ دیکھتا ہے یا بغیر عینک کے دیکھتا

ہے؟ نظر والی عینک لگا کر دیکھ رہا ہے یا کالی عینک لگا کر دیکھ رہا ہے یا کسی اور رنگ کی عینک چڑھا کر دیکھ رہا ہے؟ جو کچھ اس کو نظر آ رہا ہے ضروری نہیں کہ یہ وہی ہو جو بظاہر واقع ہو رہا ہے۔

نظریات حقائق کے بجائے نظر پر استوار ہوتے ہیں

تاریخ نگاروں کی نظریں مختلف ہوتی ہیں اور نظریات اس چیز کا نتیجہ نہیں ہوتے جو کچھ واقع ہوا ہے بلکہ نظریات ہمیشہ نظر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہماری نظر اور اندازِ نگاہ کے نتیجے میں نظریہ بنتا ہے۔ بعض اوقات ایک بہت بڑا وسیع منظر ہوتا ہے اور اس کو ہم بہت ہی چھوٹی سی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ سارا منظر ہماری نظر میں سما جائے، بہت بڑے منظر کو دیکھنے کے لیے ایک وسیع نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے اور منظر پر عمیق نگاہ ڈالنے کے لیے نظر و منظر کے درمیان ایک تناسب ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا کربلا کے واقعے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ جو کربلا کے منظر پر نظر کر رہا ہے اور کربلا کے منظر کو جھانک کر دیکھ رہا ہے اس کی نظر بھی اتنی وسیع ہو کہ وہ پورے منظر کو دیکھ سکے، پورے منظر پر نگاہ ڈال کر دیکھے تاکہ جو کچھ ظاہر اور پنہاں ہے وہ سب اسے نظر آ جائے۔ اگر مورّخ کی نظر بہت ہی چھوٹی اور تنگ ہو تو کربلا کا یہ عظیم منظر اس کی نگاہ میں کیسے آ سکتا ہے؟

نظریات حقائق کے بجائے نظر پر استوار ہوتے ہیں

فلسفۂ قیام امام حسین علیہ السلام سمجھنے کیلئے منبعِ

دوم ⇦ بصیرت:

ہر ایک کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کربلا کی تفسیر کر سکے اور اس پر نظر کر سکے، پھر اپنا نظریہ بیان

کر سکے اور مقصد کربلا تک بھی پہنچ جائے، بلکہ اس کے لیے انسان کو اتنا بڑا ہونا پڑے گا، اتنا وسیع ہونا پڑے گا کہ کربلا جیسے وسیع وعمیق اور گہرے منظر میں جھانک کر دیکھ سکے۔ اگر کوئی ایک باریک سوراخ میں سے کمزور نگاہ کے ساتھ دیکھنے کے بعد یہ کہے کہ مجھے حقیقتِ کربلا سمجھ آ گئی ہے تو یہ بات سوائے حقیقت سے دوری اور جہالت کے کچھ نہیں ہو سکتی۔

حقیقت کو ایسے دیکھنا جیسی وہ ہے

اس کے لیے ایک قانون کو مدنظر رکھا جائے اور وہ یہ ہے کہ اشیاء جیسی موجود ہیں ایسی ہمیں دکھائی نہیں دیتیں بلکہ بہت مختلف نظر آتی ہیں، جیسی ہماری نظر ہے ہمیں ویسی ہی نظر آتی ہیں نہ کہ جیسی وہ حقیقتاً ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ مظہرِ علم ذات خدا ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ دعا تعلیم دی گئی کہ

رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۝[1]

پروردگارا! میرے علم میں اضافہ فرما۔

یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب خدا کی درگاہ میں دعا کرتے ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ میرے علم میں اضافہ ہوتا کہ میری معلومات بڑھ جائیں، جس طرح کا علم لوگوں کے ذہنوں میں ہے اسی طرح کا میرا علم بھی بڑھ جائے بلکہ فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا ھِیَ..... [2]

---

[1].....سورۂ طٰہٰ، آیہ ۱۱۴ [2].....تفسیر رازی، باب ۷۵، جلد ۶، صفحہ ۳۴۳

اے اللہ ہمیں اشیاء کو ویسی دکھا جیسی وہ ہیں.....

اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی دعا میں مروی ہے کہ

يَارَبِّ أَرِنِی الْحَقَّ كَمَا هُوَ عِنْدَكَ حَتّٰی أَقْضِیَ بِهٖ.....[1]

اے پروردگار! مجھے حق اسی طرح دکھلا جیسے تیرے نزدیک ہے تا کہ میں

اسی کے مطابق فیصلہ کروں.....

یہ بہت عظیم اور عارفانہ دعائیں ہیں۔ جولوگ اپنے آپ کو پیروئے نبیؐ اور تابع نبیؐ کہتے ہیں وہ سب سے بڑا اتباع اس نکتے اور اس جملے میں کریں کہ اشیاء اور واقعات جیسے ہیں ویسے ہی نظر آئیں بلکہ یہ چلتے پھرتے انسان جیسے ہیں ویسے ہی نظر آئیں، واقعاً یہ بہت بڑی اور عظیم معانی رکھنے والی دعائیں ہیں کیونکہ ننانوے فی صد انسان اشیاء اور واقعات کو دیکھتے تو ہیں لیکن انہیں وہ واقعات جیسے ہیں ویسے نہیں دکھائی دیتے بلکہ کچھ اور طرح سے دکھائی دیتے ہیں۔

بصیرت پر ظلمات کے اندھیرے

اس کی مثال یہ ہے کہ جب سخت دھوپ میں آپ کی آنکھیں چندھیاتی ہیں تو کسی ماہر کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے کالے شیشے والی عینک چاہیے۔ آپ اپنی آنکھ پر کالا چشمہ کیوں لگانا چاہتے ہیں؟ اس لیے کہ باہر سورج کا نور شدید ہے اور میری آنکھ کی نظر کمزور ہے، سورج کے اس شدید نور کو

---

[1].....(بحار الانوار، جلد ۱۴، صفحہ ۱۱، ۱۰) (مسند الامام علی علیہ السلام، جلد ۶، صفحہ ۱۷۹)

میری آنکھیں برداشت نہیں کر سکتیں، باہر کی فضا بہت نورانی ہے اور میری آنکھیں نورانی اشیاء سے چندھیا جاتی ہیں۔ عربی میں سیاہ کو ظلمت یا ظلمات کہتے ہیں۔ پرنور فضا میں کچھ دیکھنے کے لئے اور کمزور آنکھوں کے علاج کے طور پر سیاہ ظلمانی شیشے خریدے جاتے ہیں تا کہ ان کی مدد سے عالم نور میں رہتے ہوئے اشیاء کو ظلماتی، تاریک اور سیاہ دیکھ سکیں، اس طرح آنکھوں کو تھوڑی سی ٹھنڈک بھی محسوس ہوگی اور آنکھیں چندھیائیں گی بھی نہیں۔ ایسی دکانیں بنی ہوئی ہیں کہ جہاں پر تجربہ کار ماہرین تیار بیٹھے ہوئے ہیں، جنہوں نے نورانی چیزوں کو ظلماتی دکھانے کے فن کا ڈپلومہ اور ڈگریاں حاصل کی ہوئی ہیں، ہم بھی ان کو منہ مانگی اجرت دیتے ہیں اور وہ ہمارے سائز اور ہماری پسند کا ظلمانی شیشہ ہماری آنکھ پر لگا دیتے ہیں۔ ایسی آنکھوں سے کربلا دکھائی نہیں دیتی، ورنہ اہل بصر تو بہت موجود تھے مگر انہیں واقعۂ کربلا سمجھ میں نہیں آیا، انہیں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ کربلا جیسے واقعات کو سمجھنے کے لیے بصیرت چاہیے لیکن بصیرت بھی بصر کی مانند آفت میں مبتلا ہو جاتی ہے، جس طرح سے نور بصر کبھی سورج کے شدید نور کو برداشت نہیں کر سکتا اور آنکھ چندھیا جاتی ہے، اسی طرح کبھی بصیرت بھی نور شدید سے چندھیا جاتی ہے۔

نورِ کربلا کے سامنے ظلمانی پردے

نورِ کربلا کے سامنے ظلمانی پردے

ان حالات میں کربلا کو سمجھنے کے لیے ہم ماہرین فن کے پاس جاتے ہیں اور ان سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ نور کربلا بہت شدید، بہت سخت اور بہت زیادہ ہے، اس کی شعاعیں اس قدر نورانی ہیں کہ ہماری کمزور بصیرت چندھیا گئی ہے، برداشت نہیں کر پا رہی۔ ان ماہرین نے ڈپلومہ لیا ہوا ہے، بڑے بڑے علمی مراکز سے فارغ التحصیل ہیں۔ کس چیز کا علم پڑھ کر آئے ہیں؟ روشن بصیرتوں کے اوپر ظلمانی

پردے ڈالنے کی مہارت حاصل کر کے آئے ہیں،وہ ڈپلومہ ہولڈرز (Diploma holders) روشن بصیرتوں کے آگے بہت آسانی سے ظلمانی پردے ڈالتے ہیں۔ان کی خدمات بہت عام ہیں اوراس کام کی انہیں اجرت بھی ملتی ہے۔ہم سب مل کر ایک ماہر اہلِ فن کو بلاتے ہیں جو نورانی فضاؤں کو تاریک اور ظلمانی بنانے کا فن جانتا ہے کہ یہ بصیرتیں چندھیا جاتی ہیں لہٰذا ان بصیرتوں کے آگے کالا شیشہ لگا دو تا کہ ہر شے ظلمانی اور تاریک نظر آئے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نظر کمزور بھی ہو اور تنگ بھی، اگر چہ کمزوریٔ نظر اور چیز ہے اور تنگیٔ نظر دوسری چیز ہے۔اگر نظر تیز ہو لیکن تنگ ہو تو بھی کسی منظر کو پورے طور پر دیکھ نہیں پاتی،آپ کو اپنے گھر کی کھڑکی سے پورا کراچی شہر نظر نہیں آئے گا اس لیے کہ جس زاویے سے دیکھ رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں ہے یا اگر چہ نظر تیز بھی ہے لیکن وہ کھڑکی، روزن اور سوراخ بہت تنگ ہے۔اگر نظر تنگ بھی ہو اور کمزور بھی اور اس کمزور نظر کے اوپر ایک سیاہ اور ظلمانی شیشہ بھی لگا ہوا ہو پھر انسان واقعۂ کربلا پر نگاہ کرے تو اس کو کیا نظر آئے گا؟ جب آپ کالی عینک لگا کے گاڑی چلاتے ہیں تو اطراف کا ماحول کیسا نظر آتا ہے؟ درخت کیسے نظر آتے ہیں؟ سرسبز اور ہرے بھرے نظر آتے ہیں یا سیاہ نظر آتے ہیں؟ آگے پیچھے سفید یا رنگ برنگی گاڑیاں کیسی نظر آتی ہیں؟ لوگ کیسے نظر آتے ہیں؟ درخت،لوگ،گاڑیاں اور آس پاس کا ماحول ویسا دکھائی نہیں دیتا جیسا کہ ہے بلکہ جیسی عینک ہے ویسا ہی نظر آتا ہے،آپ نے جو بھی شیشے کا رنگ انتخاب کیا ہوا ہے تو سارا ماحول بھی آپ کو ویسا ہی نظر آرہا ہے۔عینک اتار کے دیکھیں تو دنیا ہی بدل جائے گی۔آپ ایک ظلمانی اور سایہ دار شے میں چل رہے ہیں اس لیے سارے شہر پر سایہ ہی سایہ ہے،عینک اتار کے دیکھیں تو دھوپ ہی دھوپ ہے،نور ہی نور ہے۔سائے اور روشنی میں کتنا فرق ہے؟ روشنی نہ

ہونے کا نام سایہ ہے، ان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا اندھے اور آنکھ والے، ایماندار اور فاسق یا علم اور جہل میں ہے۔ علم نہ ہونے کا نام جہالت ہے، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے ایک جیسے ہیں؟ کیا ایمان اور فسق ایک جیسی چیزیں ہیں؟

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ..... [1]

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے یکساں ہو سکتے ہیں؟

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُوْنَ ۝ [2]

کیا وہ شخص جو صاحبِ ایمان ہے اس کے مثل ہو جائے گا جو فاسق ہے؟ ہرگز نہیں دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

وَمَا يَسْتَوِى الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۝ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّوْرُ ۝ [3]

اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ اندھیرا اور اجالا۔

رات سایہ ہے کیونکہ نور موجود نہیں ہے یعنی زمین ابھی منبعِ نور کے روبرو نہیں ہے۔ کالی عینک لگا کر اشیاء کو دیکھیں تو یہ ویسی نظر نہیں آ رہیں کہ جیسی ہیں۔ لہٰذا یہ عالم کہ جس کو ہم دیکھ رہے ہیں حقیقت میں کچھ اور ہے ہمیں کچھ اور نظر آ رہا ہے۔ اس لیے سب سے بڑی دعا یہ ہے کہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خداوند تعالیٰ سے مانگی:

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْاَشْيَاءَ كَمَا هِيَ.....

---

[1] .....سورۂ زمر، آیہ ۹ [2] .....سورۂ سجدہ، آیہ ۱۸ [3] .....سورۂ فاطر، آیہ ۲۰، ۱۹

اے اللہ ہمیں اشیاء کو ویسی دکھا جیسی وہ ہیں.....

واقعۂ کربلا ہمیں ویسا ہی نظر آئے جیسا ہے، یہ ایک بہت بڑی عرفانی دعا ہے۔ کربلا سب کو نظر آرہی ہے لیکن جیسی ہے ویسی نظر نہیں آرہی کیونکہ نظریں محدود اور تنگ ہیں اور پھر ان پر ظلمانی پردے پڑے ہوئے ہیں۔

لہٰذا واقعۂ کربلا سمجھنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ساری عینکیں اتار دی جائیں، تاریخ بھی ایک سیاہ عینک ہے اس لیے کہ تاریخ نہ صد فیصد صحیح رقم ہوئی ہے اور نہ ہی اسی طرح صحیح نقل ہوئی ہے۔ اگر صحیح بھی ہوتی تو بھی تاریخ ایک شفاف عینک نہیں بلکہ محدود اور کمزور ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ صرف تاریخ کو اساس قرار دے کر حقیقتِ کربلا، واقعۂ کربلا اور فلسفۂ کربلا سمجھنا انسان کو غلط نتائج تک بھی پہنچا سکتا ہے جیسا کہ بعض کو پہنچایا بھی ہے کہ جس کے بعض نمونے ہم آگے جا کر نقل کریں گے۔

پس سب سے پہلے فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام کو سمجھنے کے لیے بصیرت کی ضرورت ہے اور وہ بھی صاف و شفاف بصیرت کہ جس کے آگے ماہرینِ فن نے تاریک پردے آویزاں نہیں کیے۔

فلسفۂ قیام امام حسین علیہ السلام سمجھنے کیلئے منبعِ

سوم ⇦ کربلا کا ماحول

فلسفہ قیام امام حسین علیہ السلام سمجھنے کے لیے کربلا جانا پڑتا ہے۔ پہلے درج ہو چکا ہے کہ فلسفۂ قیام امام حسین علیہ السلام کو سمجھنے کے لیے صرف تاریخ کافی نہیں بلکہ تاریخ کے ساتھ ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت ہے

اور وہ بھی صاف اور شفاف بصیرت لیکن بصیرت کے ساتھ ساتھ ایک تیسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ آپ جس حادثہ یا واقعہ کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو جب تک آپ اس ماحول میں نہ جائیں کہ جس میں یہ واقعہ رونما ہوا ہے اس وقت تک اس کی حقیقت کو صحیح طور پر درک نہیں کر سکتے۔ اس ماحول میں منتقل ہوئے بغیر صرف پڑھنے یا سننے سے اس کا احاطہ نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح حادثہ کربلا بھی ہے کیونکہ کربلا صرف پڑھ کر سمجھنے کی چیز نہیں۔

کربلا تک احساس کے ذریعے رسائی

واقعۂ کربلا میں فقط پڑھنے سے تعلق رکھنے والی باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے دامن میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو لمس اور احساس سے تعلق رکھتی ہیں، جب تک ان کو محسوس اور لمس نہ کیا جائے ان کی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ آپ روزانہ ٹی وی، اخبارات یا ریڈیو پر پوری دنیا کا ٹمپریچر (Temperature) سنتے ہیں، مری میں بیٹھا ہوا انسان کہ جو کبھی بھی مری سے باہر نہیں نکلا جب سنتا ہے کہ جیکب آباد کا درجۂ حرارت پچاس کے قریب ہے تو اس کو گرمی کی شدت کا احساس نہیں ہوتا اس لیے کہ گرمی کی شدت سن کر یا پڑھ کر وہاں کی گرمی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ گرمی ایک ایسی چیز ہے کہ جب تک کوئی گرم فضا میں نہ جائے تو اسے محسوس نہیں ہوتا کہ گرمی کہتے کس کو ہیں۔ سردی بھی اسی طرح ہے، زمین پر ایسے بھی خطے ہیں جہاں منفی چالیس پچاس درجہ سردی پڑتی ہے۔ گرم علاقے کا رہنے والا اگر اتنی شدید سردی کا سنتا ہے یا پڑھتا ہے تو اسے سمجھ نہیں پاتا۔ منفی پچاس درجے سردی کو محسوس

کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان سامانِ سفر باندھے اور اس نقطے پر جا پہنچے جہاں اتنا درجۂ حرارت موجود ہے۔ جب ایسا شخص واپس آئے گا تو اس شدت کی سردی کے بارے میں پوری زندگی واقعات سناتا رہے گا۔ یہ تو عام جسمانی، بدنی اور حس سے تعلق رکھنے والے امور تھے۔ اسی طرح حادثہ کربلا پڑھ کر یا سن کر اگر کسی کی سمجھ میں آجائے تو وہ یقین کر لے کہ یہ کربلا نہیں ہے۔

ڈرامہ، کہانی، ناول پڑھ کر یا سن کر سمجھ میں آجاتے ہیں کیونکہ یہ لکھے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ بس پڑھے جائیں، افسانے کی ساری حقیقت وہی سیاہی ہوتی ہے جو کاغذ پر بکھری ہوتی ہے، ناول الفاظ کے ماورا کچھ نہیں ہوتا، یہ انسان کے ذہن اور تخیل کی پیداوار ہے، یہ فقط الفاظ ہیں، اول بھی یہی الفاظ ہیں آخر بھی یہی الفاظ ہیں۔ الفاظ سے ماجرا شروع ہوتا ہے اور الفاظ پر ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن جہاں پر الفاظ کے ماورا ایک حقیقت موجود ہو وہاں پر انسان کو پڑھنے سے اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا، اس کے لیے ضروری ہے کہ سامانِ سفر باندھیں، زادِ سفر تیار کریں اور اس فضا اور ماحول میں پہنچ جائیں، یقین جانئے کہ صرف سننے سے یہ چیزیں سمجھ میں نہیں آئیں گی۔

اس کی بہترین دلیل ہم خود ہیں اس لیے کہ اگر سننے سے حقیقت کربلا سمجھ میں آجاتی تو آج ہم ایسے نہ ہوتے، ہم نے سنا تو بہت ہے، پڑھا بھی ہے جبکہ کربلا پڑھنے اور سننے کی چیز نہیں ہے۔ قیامِ کربلا کے اندر بہت سارے ایسے حقائق ہیں کہ جنہیں نہ لکھا گیا نہ دیکھا گیا، انہیں صرف لمس کرنے کی ضرورت ہے اور ان کو لمس کرنے کیلئے کربلا میں جانا ضروری ہے۔

کربلا جانے سے مراد؟

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ کل ہی جا کر زیارتی کاروان میں اپنا نام لکھوا دیں اور کربلا چلے جائیں تو حادثہ کربلا کی حقیقت آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ اگر آپ چلے گئے لیکن بصیرت سے کام نہ لیا تو نہ صرف حقیقتِ کربلا سمجھ میں نہیں آئے گی بلکہ اصل کربلا سے بہت دور بھی ہو سکتے ہیں۔

آج کربلا ایک خوبصورت شہر بنا ہوا ہے لیکن ہماری مراد ۶۱ھ کی سرزمینِ کربلا ہے جس کیلئے دو سفر کرنے پڑیں گے لہٰذا کسی ایسے کاروان میں نام لکھوا دیں کہ جو آپ کو مکانی سفر بھی طے کروائے یعنی آپ کو پاکستان سے اٹھائے اور سرزمینِ عراق کی کربلا پر پہنچا دے اور ساتھ ہی زمانی سفر بھی کروائے یعنی پندرہویں صدی ہجری سے اٹھائے اور ۶۱ھ میں لے جائے۔ اگر آپ کو ایسا کوئی کاروان ملتا ہے تو اس میں اپنا نام لکھوا دیں، اس سے کہیں کہ مجھے سید الشہداء علیہ السلام کی زیارت کرنی ہے لیکن یہ زمانی سفر کون کرائے؟ اتنی صدیاں ہمیں کون پیچھے لے کر جائے؟ وہ کاروان کہاں ہے جو ہمیں پندرہویں صدی ہجری سے منتقل کرے اور ۶۱ھ میں لے جائے؟ اس کے لیے وسیلۂ سفر اور زاد و توشۂ سفر کیا ہے؟ اگر ایسا کوئی کاروان مل جائے اور زادِ سفر بھی ساتھ ہو تو یہ سفر ضرور کریں۔

جب آپ یہ دونوں سفر طے کر کے کربلا جا پہنچیں گے تو اس وقت کربلا کا درجہ حرارت محسوس کریں گے! اس وقت سمجھ میں آئے گا کہ حق و باطل کیسے برسرِ پیکار ہیں؟ اس صاف و شفاف آئینہ میں آپ کو وہی لشکر بنی امیہ، وہی منافق، وہی بے دین دکھائی دیں گے اور ان کے مقابلے میں امام حسین علیہ السلام یکہ و تنہا نظر آئیں گے۔

سیّار ریڑھی بانوں کے ساتھ کربلا نہ جائیں

یوں نہ ہو کہ جیسے پہلے زمانے میں ہوتا تھا کہ جب سینما گھر نہیں بنے تھے تو پھر بھی لوگ فلمیں دیکھتے تھے لیکن طریقہ یہ تھا کہ ریڑھی پر ایک باکس بنا ہوا ہوتا تھا اور اس کے دونوں طرف شیشے لگے ہوتے تھے، ریڑھی بان ہاتھ سے ہینڈل چلاتا تھا تو ساتھ پردے پر تصویر آتی تھی، ریڑھی کے دونوں طرف عورتیں، مرد اور بچے بیٹھ جاتے تھے۔ ریڑھی بان گلی کوچوں میں جا کر آوازیں دیتا تھا کہ آؤ ولایت کی سیر کریں، یعنی ویسٹ کی، یورپ کی یوں ہی سیر کراتے، ریڑھی پر یورپ کی فلم دکھاتے تھے۔ لوگ بھی ولایت کی فلم دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ ہم نے ولایت دیکھا حالانکہ ریڑھی پر جو ولایت نظر آتی تھی وہ ولایت نہیں تھی۔

اسی طرح اگر کوئی ہمیں کربلا دکھائے، کوئی ریڑھی بان محلے میں آئے، مجمع اکٹھا کر کے ہینڈل گھماتا جائے، بولتا جائے اور ہم فقط دیکھتے، سر دھنتے اور واہ واہ کرتے جائیں اور پھر جب تقریر ختم ہو تو ہم گمان کریں کہ ہم نے کربلا دیکھ لی ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ لوگ ولایت دیکھتے تھے۔ اس طرح کربلا کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی بلکہ حادثہ کربلا کی حقیقت سمجھنے کے لیے کربلا جانا پڑتا ہے، وہاں منتقل ہونا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو امام حسین علیہ السلام کے اصحابؓ کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھنا ہوگا اور یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ جس پر باہمت لوگ جا بھی چکے ہیں۔ زیارتِ امام حسین علیہ السلام کے اس جملے میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

يَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَكُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزاً عَظِيْماً.....

اے کاش! میں بھی آپؑ کے ساتھ ہوتا تو عظیم کامیابی پر فائز ہوتا.....

کربلا کے ساتھ رابطوں کی نوعیت

عقیدت کا رابطہ

ویسے تو پوری دنیا کو اس عظیم قیام کا احساس ہے، حتیٰ مسلم اور غیرِ مسلم کی تفریق کے بغیر سبھی سید الشہداء علیہ السلام کے قیام کے معترف ہیں اور اپنے آپ کو کسی حد تک اس سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ ان کے قلمی آثار بھی موجود ہیں اور بہت سارے عینی شواہد اور نمونے بھی موجود ہیں کہ جہاں پر انہوں نے امام حسین علیہ السلام کے متعلق اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ مسیحیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے اس عظیم قیام کے متعلق اظہارِ عقیدت کر کے اپنے آپ کو کسی حد تک اس سے منسلک سمجھا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں باوجود اس کے کہ غیر مسلم مملکت ہے عاشور کے دن عام چھٹی ہے اور پاکستان جو کہ مسلم مملکت ہے اس میں دو دن چھٹی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعض عرب مسلم ریاستوں میں بھی دو دن یا ایک دن چھٹی ہوتی ہے۔ غیر مسلم ایک دن چھٹی کر کے اور مسلمان دو دن چھٹی کر کے امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں احترام و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ جن کو ذرا زیادہ عقیدت ہے وہ دس دن مجالس برپا کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ دنوں کی تعداد کم یا زیادہ ہو سکتی ہے اور اس سے شاید یہ اندازہ بھی لگایا جا سکے کہ قربت اور رابطہ میں فرق بھی ہے، یہ اتنے ایام مقرر کرنا اور ان میں مجالس کا اہتمام کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ امام حسین علیہ السلام سے رابطہ اور لگاؤ ہے۔

روحِ کربلا سے رابطہ

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کا شعار ہے کل یوم عاشورا، کل ارضٍ کربلا، جن کے

لئے سال کا ہر دن عاشورا ہے، ان کی یہ عقیدت واحترام سال بھر محفوظ ہے یعنی ہر دن کل یوم عاشورا، کل ارض کربلا کا مصداق ہے کہ جس طرح عاشورا کو مجالس، عزاداری اور گریہ کا اہتمام ہوتا ہے، وہ سال بھر گریہ وعزا میں مشغول رہتے ہیں۔ جس طرح عاشور کے دن ہر ذہن سید الشہداء علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اسی طرح ان کا ذہن سال بھر سید الشہداء علیہ السلام کے ساتھ رہتا ہے، ایسے لوگ اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اپنی پوری زندگی کو عاشور میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ بعض تو عاشور کے دن بھی اپنی معمول کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن کچھ اپنے دوسرے ایام زندگی میں بھی عاشور برپا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آخر کار شہادت کی منزل پا کر سید الشہداء علیہ السلام سے جا ملتے ہیں۔

وہ عظیم شخصیات جو سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی راہ پر گامزن تھیں ان کا قیامِ کربلا کے ساتھ بہت عمیق رابطہ ہوتا تھا۔ ان میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ ان کا رابطہ روحِ عاشور کے ساتھ تھا، یہ لوگ روحِ عاشورا اور فلسفۂ قیام امام حسین علیہ السلام کو سمجھ گئے تھے اور جو بھی اس مقام پر پہنچ جائے، جو بھی اس پیغام اور روح کو دریافت کر لے اس کی یہی حالت ہوگی۔ جس کا کربلا سے اتنا عمیق اور گہرا رابطہ ہو تو اس کی یہی حالت ہوگی۔ یہ ان اختیاری حالات میں سے نہیں ہے کہ انسان جب چاہے اپنے اوپر کربلا طاری کر لے اور جب چاہے تو اپنے اوپر سے ہٹا لے۔

عقیدت کا رابطہ

بعض لوگ ہوتے ہیں کہ آنسو پونچھ کر قہقہہ لگانا شروع کر دیتے ہیں اور قہقہہ لگاتے ہوئے ایک دم آنسو نکالنا شروع کر دیتے ہیں یعنی لباس کی طرح جب چاہیں پہن لیتے ہیں اور جب جی چاہے اتار دیتے ہیں، یہ وہ حالتیں ہیں جو انسان مصنوعی طور پر اپنے اوپر طاری کرتا ہے لیکن جو حالتیں اندر سے باہر آتی ہیں وہ ان سے مختلف ہوتی ہیں، قلبی حالت سے چہرے پر جو آثار رونما ہوتے ہیں وہ اختیاری

نہیں ہوتے۔اس لیے کہ انسان کا چہرہ،آنکھیں اور پورا وجود اس کے دل اور روح کے اختیار میں ہوتا ہے،بدن پر رونما ہونے والے آثار روح کے آثار ہوتے ہیں اور روح اتنی جلدی حالتیں تبدیل نہیں کرتی۔انسان کی روح پر یہ حالت اس وقت طاری ہوتی ہے کہ جب اس کی روح کربلا کی روح سے آشنا ہوجائے لہٰذا پھر اس انسان کا ہر دن عاشور ہے۔

احساساتی اور روحانی رابطوں میں فرق

ایک آدمی جب قیام کربلا پر نگاہ کرے اس کو روح قیام نظر آئے اور دوسرا آدمی جب اس قیام پر نگاہ دوڑائے تو اس کو کچھ اور نظر آئے تو ان دونوں کی نگاہوں کی تأثیر و تأثر میں فرق ہوگا،جو کسی منظر کی روح دیکھ کر متاثر ہوتا ہے اس کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے اور جو ظاہر دیکھ کر متاثر ہو اس کی کیفیت کچھ اور ہے۔ کبھی انسان کا ظاہر قیامِ امام حسین علیہ السلام کے ظاہر کے ساتھ مس ہوتا ہے اور کبھی انسان کی روح اس قیامِ مقدس کی روح کے ساتھ ارتباط برقرار کر لیتی ہے لہٰذا پھر ان دونوں انسانوں میں بڑا واضح فرق نظر آتا ہے۔جیسا کہ جب ہم زیارات پر جاتے ہیں اور امام علیہ السلام کے حرم میں داخل ہوتے ہیں تو ضریح مقدس کے قریب جا کر ہماری حالت کچھ اور ہوتی ہے لیکن جونہی حرم سے نکلتے ہیں اور ضریح امام علیہ السلام کو چھوڑ دیتے ہیں تو وہ حالت باقی نہیں رہتی۔

جس زمانے میں امام علیہ السلام حاضر تھے اور لوگ ان کی زیارت کے لیے جاتے تھے تو کچھ لوگوں نے امام علیہ السلام سے پوچھا کہ جب ہم آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو ہمارے اوپر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن جونہی آپؑ کی بارگاہ سے نکلتے ہیں تو وہ حالت ختم ہو جاتی ہے،اس کی کیا وجہ

ہے؟اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ اس زمانے میں بھی ایسے ہی تھے کہ امام علیہ السلام کے حضور میں ہوتے تو کچھ اور حالت ہوتی تھی لیکن جب امام علیہ السلام سے دور ہوتے تو کچھ اور حالت ہو جاتی تھی۔

ظاہری ملاپ اور روحانی ملاپ کا فرق

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ جب کوئی امام علیہ السلام کی بارگاہ میں جاتا ہے، خواہ حیات میں جائے یا شہادت کے بعد امام علیہ السلام کے مزار پر حاضری دے تو وہ یا تو اپنے ظاہر کو اس ظاہری ماحول سے جا کر مس کرتا ہے یا اپنے باطن اور روح کو امام کی روح کے قریب لے جاتا ہے، جب انسان فقط اپنے ظاہر کو حرم کے ظاہر سے مس کرے تو جب تک دو ظاہر آپس میں مس ہو کر مرتبط رہتے ہیں ہمارے دل پر ایک خاص حالت طاری ہوتی ہے اور جونہی امام علیہ السلام کی بارگاہ سے باہر نکلتے ہیں اور دو ظاہروں میں فاصلہ پڑتا ہے تو وہ حالت باقی نہیں رہتی۔ لیکن جب انسان روحِ امام علیہ السلام کے ساتھ آشنا ہو کر اپنی روح کے ذریعے رابطہ پیدا کرے تو پھر فرق نہیں پڑتا کہ وہ امام علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہو یا باہر ہو۔ ضریح امام کے ساتھ کھڑا ہو تو بھی وہی حالت ہوگی اور اگر ضریح سے بہت دور ہو تو بھی وہی حالت ہوگی اس لیے کہ اب انسان کی روح امامؑ کی روح سے مرتبط ہو چکی ہے اور روح اتنی جلدی حالتیں تبدیل نہیں کرتی۔

جس طرح اویس قرنیؒ کی روح طویل زمینی فاصلے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح سے متصل تھی اور ان پر ہمیشہ وصال کی مخصوص کیفیت طاری رہتی تھی جبکہ کچھ مدینے میں حضرتؐ کی بارگاہ میں ہوتے ہوئے بھی اس حالت سے محروم تھے لہٰذا اگر ہم دس بارہ دن مجالسِ عزا برپا کرتے ہیں، ماتم اور گریہ کرتے ہیں اور ہماری کیفیت بھی دوسرے دنوں سے مختلف نہیں ہوتی تو یہ سب کچھ بتاتا ہے کہ

ہمارا رابطہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ کتنا ہے؟ ہمارا ارتباط اتنا ہی ہے کہ ہم دس دن سوگ مناتے ہیں جبکہ بعض مسلم ممالک بھی عام چھٹی کر کے دو دن سوگ مناتے ہیں، بھارت جیسی غیر مسلم مملکت بھی ایک دن سرکاری چھٹی کر کے اظہارِ عقیدت کرتی ہے لیکن جس کا ہر دن عاشورا ہو اور جو سال بھر اس قیام مقدس کے ساتھ متصل رہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فقط اس کے ظاہر سے اپنے آپ کو مس نہیں کیا ہوا ہے بلکہ وہ روحِ عاشورا سے مرتبط ہے۔

احساساتی اور جذباتی حالتیں وقتی ہیں

ظاہری ارتباط احساسات اور جذبات کی حد تک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر یہ خاصیت رکھی ہے کہ انسان احساساتی، جذباتی اور عاطفی مخلوق ہے، اگر ہم تھوڑا سا غور اپنے روزمرّہ کے اوقات پر کریں تو شاید ہم بیسیوں دفعہ جذباتی اور احساساتی ہو جاتے ہیں، بیسیوں دفعہ غصہ بھی آجاتا ہے اور بیسیوں دفعہ خوش بھی ہوتے ہیں۔ احساسات و جذبات کی حالتیں ہم پر دم بدم بدلتی رہتی ہیں، ایک خبر سن کر خوش ہو جاتے ہیں تو دوسری خبر سن کر افسوس کرتے ہیں۔ ایک اخباری خبر کے مطابق پولیس نے ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے دو معصوم بچوں کو ماں کی گود میں گولی مار دی تو ساری دنیا نے افسوس کیا، ان پر لعنت کی، آخر یہ کیا طریقہ ہے کہ ماں کی گود میں معصوم بچوں کو مار دیا؟ دیکھئے ہمارے احساسات متاثر ہوتے ہیں، اب ظاہر ہے جنہوں نے ان ننھی ننھی لاشوں کو دیکھا ہوگا وہ شاید رو بھی پڑے ہوں گے اس لیے کہ انسان کو خدا نے پتھر نہیں بنایا بلکہ انسان کے دل پر یہ چیزیں اثر کرتی ہیں لیکن یہ چیزیں احساساتی اثرات ہیں۔

کربلا کا احساساتی پہلو

کربلا میں بھی احساساتی مناظر بہت زیادہ ہیں جنہیں سن کر شیعہ بھی متاثر ہوتا ہے، سنی بھی متاثر ہوتا ہے حتیٰ غیر مسلم بھی متاثر ہوتا ہے لیکن یوں نہیں ہے کہ جو بھی کربلا کے کسی منظر سے متاثر ہوا تو گویا اس نے حقیقتِ کربلا کو سمجھ بھی لیا ہو بلکہ یہ وہ پہلو ہے جس سے قاتلینِ کربلا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ جیسا کہ روایت میں ہے کہ عصر عاشور کو ملاعین جب خیام حسینی کو لوٹنے آئے تو بیبیوں کے پردے بھی چھین رہے تھے اور ساتھ رو بھی رہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق جنابِ فاطمہؑ بنتِ حسینؑ نے ایک ظالم سے کہ جو لوٹ بھی رہا تھا اور رو بھی رہا تھا پوچھا کہ یہ تضاد سمجھ میں نہیں آتا، لوٹتے بھی ہو، ستم بھی کرتے ہو اور ساتھ روتے بھی ہو؟ اس نے کہا کہ روتا اس لیے ہوں کہ آپ مظلوم ہیں اور آپ خاندان نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ہیں، کہا کہ جب روتے ہو اور ہم پر اتنا رحم بھی آ گیا ہے تو پھر لوٹتے کیوں ہو؟ کہا کہ اگر میں نے نہ لوٹا تو کوئی اور لوٹ کے لے جائے گا اس لیے لوٹ رہا ہوں۔ اسی طرح کوفہ اور شام میں بہت سے ایسے مناظر سامنے آئے کہ جہاں کوفی اور شامی روتے رہے لہٰذا احساسات کی رو میں بہہ جانا اور صرف احساسات کے آنسو رونا معرفت کی دلیل نہیں ہے۔

اس قیامِ مقدس کے ساتھ احساسات کی حد تک کا ارتباط کوئی اہم چیز نہیں ہے بلکہ اس حد تک تو ہر انسان مرتبط ہو سکتا ہے لیکن وہ لوگ جو روحِ عاشورا اور حقیقتِ کربلا سے مرتبط ہیں، جن کو فلسفۂ قیامِ مقدس معلوم ہے ان کا رابطہ فقط احساساتی نہیں ہوتا ہے، اگرچہ احساساتی رابطہ بھی ضرور ہوتا ہے چونکہ وہ بھی انسان ہیں، ان کے بھی احساسات ہیں جیسے خود سید الشہداء علیہ السلام باینکہ معصوم ہیں لیکن بعض مناظر ایسے آئے تھے کہ جہاں پر امام علیہ السلام نے احساسات کا اظہار کیا، بعض مقامات پر رو پڑتے ہیں، لہٰذا

احساسات وعواطف کا اظہار کرنا کوئی بُری بات نہیں۔ بات اس میں ہے کہ انسان فقط احساسات کی حد تک مربوط رہے اور اپنے آپ کو عاشورائی کہے تو یہ کافی نہیں ہے اس لیے کہ احساساتی رابطہ فقط اظہارِ احساسات کی حد تک ہوتا ہے۔ ظاہری ارتباط کبھی بھی انسان کو منزلِ شہادت تک نہیں لے جاتا، جو رابطہ جو انسان کو منزلِ شہادت تک پہنچاتا ہے وہ اس قیامِ مقدس کے پیغام کی روح کے ساتھ رابطہ ہے۔

کربلا اسوہ ہے

اس قیامِ مقدس کا پیغام اس جملہ میں بیان ہوا ہے کہ امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَکُمْ فِیَّ اُسْوَۃٌ..... [1]

میری ذات تمہارے لیے نمونہ ہے، میں تمہارے لیے اسوہ ہوں۔ کربلا کو اسوہ قرار دینا، حضرت امام حسین علیہ السلام کی تأسی کرنا اور اپنے لیے نمونہ قرار دینا ہی حقیقی رابطہ ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی زندگی میں بہت ساری حالتیں تھیں لیکن عاشورا کے دن اس حالت میں کھڑے ہو کر یہ فرماتے ہیں کہ میں تمہارے لیے نمونہ ہوں تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ میری یہ حالت ہے کہ اب دشمنوں کے نرغے میں ہوں، کوئی ناصر اور حامی نہیں ہے، حق کے دفاع کے لیے یکہ وتنہا کھڑا ہوں، دین کی حفاظت کرتے ہوئے سب کچھ قربان کر دیا ہے یعنی آج کے دن جو میری حالت ہے یہ تمہارے لیے نمونہ ہے، نمونہ کے معنیٰ یہ ہیں کہ تم بھی ایسی شکل، ایسا حلیہ اور ایسا رنگ وروپ اختیار کرو کہ مجھ جیسے بنو۔

---

[1]..... (مقتل المقدم، صفحہ ۱۸۴) (تاریخ طبری، جلد ۵، ص ۴۰۳، قاہرہ)

جیسا کہ کسی چھوٹے بچے کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر آپ اپنے بچے سے کہتے ہیں کہ دیکھو یہ چھوٹا سا بچہ تمہارے لیے نمونہ ہے یعنی تم بھی ایسی نماز پڑھو یا ایک بچہ اچھے نمبر لیتا ہے تو آپ کہتے ہیں دیکھو یہ بچہ کتنا اچھا پڑھتا ہے یہ تمہارے لیے نمونہ ہے۔ لیکن اگر کوئی اس نمونے کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس نمونے جیسی بود و باش اختیار کرے اور اس کے لباس اور وضع قطع کو اپنائے تو کیا ہم اس کو اس نمونہ کی پیروی کہیں گے؟ اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ نمونہ قرار دیئے جانے والا بچہ پڑھائی میں نمونہ ہے نہ کہ اپنی ظاہری حالت کی وجہ سے دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہے، تو سید الشہداء علیہ السلام نے جس حالت اور مقام میں یہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے لیے نمونہ ہوں وہی حالت نمونہ ہے۔ جن کے لیے ہر دن عاشورا ہو اور ہر زمین کربلا ہو وہ آخر کار اپنے امام کے ساتھ مل جاتے ہیں، کربلا یعنی شہادت کی جگہ، شہادت کی سرزمین، عاشورا یعنی شہادت کا دن، تو جس نقطہ پر یہ کام کیا جائے اور زمین کے کسی بھی نقطہ پر اسی مقصد کے تحت خون بہایا جائے اور شہادت پیش کی جائے وہ سرزمین کربلا ہے اور جس دن، جس گھڑی میں یہ کام کیا جائے وہ گھڑی عاشورا ہے۔ **کل یوم عاشورا، کل ارض کربلا** کے یہی معنیٰ ہیں۔ آپ کو اختیار حاصل ہے کہ ساری عمر میں ایک مرتبہ بھی کربلا تشکیل نہ دو یا چاہو تو ہر روز اپنے لیے ایک کربلا بنالو، چاہو تو اپنے لیے ہر روز ایک عاشورا بنالو۔

لہٰذا حقیقت میں وہ لوگ کہ جنہوں نے امام حسین علیہ السلام سے وہ پیغام "لَكُمْ فِيَّ اُسْوَةٌ" سن لیا اور یہ پیغام ان کی سمجھ میں آ گیا کہ ہمارا اسوہ اور نمونہ امام حسینؑ کی ذاتِ گرامی ہے تو یہی وجہ ہے کہ اتنی مدت کے بعد آج بھی ان کی آنکھوں کے سامنے یہ نمونہ موجود ہے، پس انہوں نے زمین کا انتخاب بھی کرلیا، زمانے کا انتخاب بھی کرلیا اور وہی کچھ جو امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا بن کر دکھا بھی دیتے ہیں۔ اس

کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو فقط ظاہر سے مس نہیں کیا ہوا، ان کا رابطہ فقط احساساتی رابطہ نہیں ہے بلکہ وہ اس ظاہر کے باطن میں بھی اترے ہوئے ہیں اور انہوں نے باطن کے ساتھ ارتباط برقرار کرلیا ہے۔

ہر ایک کی الگ کربلا

چھوٹے انسان کی کائنات بھی چھوٹی

اگر چہ ہمارا گمان یہ ہے کہ ہم سب ایک ہی کائنات میں رہ رہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ کوئی بھی دو فرد ایک جہان اور ایک کائنات میں زندگی بسر نہیں کر رہے، ہر ایک کی الگ الگ کائنات ہے، شاید یہ تعجب کی بات ہو کیونکہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے ایک ہی کائنات بنائی ہے لیکن پھر بھی اس دنیا میں ہر فرد کی اپنی ایک الگ مخصوص کائنات ہے کہ جس میں وہ اپنی خاص زندگی بسر کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات خلق کی اور خلق کرنے کے بعد انسان سے کہا کہ تم اس میں نظر کرو، ایک بار نہیں بلکہ بار بار اس منظر کو دیکھو۔

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ○ [1]

---

[1] ..... سورۂ ملک، آیہ ۳، ۴

اس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر بنایا تو رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بدنظمی نہیں دیکھے گا، ذرا پھر پلٹ کر دیکھو کیا تم کوئی خلل پاتے ہو؟ پھر پلٹ کر دوبارہ دیکھو تمہاری نگاہ عاجزانہ طور پر تھک کر لوٹ آئے گی۔

انسان اس کائنات پر نظر دوڑانے کے بعد اپنا ایک نظریہ پیدا کرتا ہے لہٰذا کائنات کا نظریہ کائنات پر نظر کرنے کا نتیجہ ہے، اس طرح ہر انسان کی ایک الگ کائنات ہے اور اس کائنات کے بارے میں اس کا اپنا ایک نظریہ ہے، حقیقت میں انسان اس منظر میں زندگی بسر نہیں کر رہا ہوتا ہے بلکہ اپنے نظریہ میں رہ رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا نظر و منظر انسان کی کائنات نہیں بلکہ انسان کی کائنات اس کا نظریہ ہے۔ بعض لوگوں کی کائنات بہت بڑی اور وسیع ہے جبکہ بعض لوگوں کی کائنات بہت ہی چھوٹی سی ہے۔

زمانہ قدیم میں آبادیاں اور بستیاں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں لیکن ان میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے شاگرد و اصحاب جو بہت عظیم شخصیات تھیں بہت ہی چھوٹی آبادیوں میں پیدا ہوئی ہیں۔ تاریخ میں جتنے پیچھے جائیں تو آپ کو بستیاں بہت چھوٹی اور محدود نظر آئیں گی لیکن ان میں پیدا ہونے والی شخصیات آپ کو بہت عظیم نظر آئیں گی۔ مثلاً کسی علمی میدان میں دیکھیں تو جتنا تاریخ میں پیچھے جائیں گے آپ کو اتنی ہی باعظمت شخصیات ملیں گی مثلاً ارسطو، افلاطون، سقراط وغیرہ کہ جو حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ یہ وہ عظیم الشان حکماء ہیں کہ جن کی تعلیمات نے آج تک شرق و غرب کو متاثر کیا ہوا ہے حالانکہ یہ لوگ انبیاء بھی نہیں تھے بلکہ غیر معصوم اور عام انسان تھے لیکن اتنے عظیم انسان تھے کہ آج ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی ان کے افکار انسانی ذہن پر اثر انداز ہیں۔ یہ لوگ چھوٹی بستیوں میں پیدا ہوئے، روم اور یونان کے چھوٹے چھوٹے گاؤں ان کی جائے تولد

تھے لیکن جوں جوں بستیاں بڑھتی گئیں شخصیات چھوٹی ہوتی گئیں، آج کل شہر بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں لیکن ان میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے انسان رہتے ہیں۔

کبھی بھی اس طرح نہیں ہوتا کہ جب انسان چھوٹا ہو جائے تو اس کی نظر میں کائنات بھی بڑی ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے کائنات بھی چھوٹی نظر آتی ہے چونکہ چھوٹے انسان کا نظریہ بہت ہی چھوٹا اور محدود ہوتا ہے، چھوٹے نظریہ سے دیکھی جانے والی کائنات بھی بہت ہی چھوٹی ہوتی ہے۔ دیکھئے ہم اپنی کائنات کا تعارف کیسے کرواتے ہیں۔ حالانکہ اس تعارف کے پیچھے پوری حقیقت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر صرف تعارف ہوتا تو اس میں اتنی قباحت نہیں ہوتی لیکن اس کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو جب ہم کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں تو ایک بہت ڈراؤنی اور خوفناک چیز بن جاتی ہے مثلاً جب ہم کسی سے پوچھتے ہیں کہ کہاں کے ہو؟ تو جواب ملتا ہے کہ کراچی کے فلاں محلے سے ہیں، یہ بہت وسیع حدود اربعہ حضرت انسان نے بیان کیا ہے حالانکہ انسان اس سے بھی زیادہ محدود تر ہیں یعنی یہ پوری کائنات کہ جس میں لاکھوں کی تعداد میں کہکشائیں ہیں، یہ اس مادی کائنات کے متعلق ہے ورنہ غیر مادی کائنات کا ایک الگ تصور ہے، یہ مادی کائنات اتنی کہکشاؤں سمیت ان خزائن الٰہی کی ایک جھلک ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ..... [1]

اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں.....

پھر یہ کائنات اور کہکشائیں کہ جن کی وسعت کے تصور سے عقل دنگ رہ جاتی ہے، ان

چھوٹے انسان کی کائنات بھی چھوٹی

---

[1]..... سورۂ حجر، آیہ ۲۱

کہکشاؤں میں ایک چھوٹی سی کہکشاں ہماری ہے، ہماری اس چھوٹی سی کہکشاں کا ایک نظام منظومۂ شمسی ہے، اس منظومۂ شمسی میں سورج مرکز ہے، اس کے سیّارات ہیں، من جملہ ایک چھوٹا سا سیارہ زمین بھی ہے، پھر زمین پر براعظم ہیں ان میں سے ایک براعظم ایشیا ہے، اس میں کئی ممالک ہیں ان میں سے ایک ہمارا ملک پاکستان ہے کہ جس میں ایک نقطہ کراچی ہے، اس میں ہمارا ایک محلّہ ہے، اس محلّہ میں ہمارا گھر ہے، گھر میں ایک کمرہ ہے اور کمرے میں ایک بچھا ہوا پلنگ ہے اور اس پر حضرت انسان بیٹھا ہوا ہے۔ یہ میری ساری کائنات ہے، تو کیا میں خدا کی بنائی ہوئی کائنات میں زندگی بسر کر رہا ہوں؟ نہیں خدا نے اتنی چھوٹی، پلنگ کے برابر کائنات نہیں بنائی تھی۔

انسان کی غرضِ خلقت

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَتَزْعَمُ أَنَّکَ جِرْمٌ صَغِیْرٌ وَ فِیکَ انْطَوَی الْعَالَمُ الأَکْبَرُ..... [1]

(اے انسان) کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو بس اک چھوٹا سا جسم ہے درحالیکہ تیرے وجود میں ایک بڑی دنیا (عالمِ اکبر) پوشیدہ ہے.....

یعنی ہم نے یہ قطرہ، یہ ذرہ خلق کیا تھا کہ یہ پھیل کر کائنات کی حد تک وسیع ہو جائے، انسان جو ایک چھوٹا سا قطرہ تھا اس کی غرض خلقت یہی تھی کہ یہ پھیل جائے، پلنگ کے برابر تو پھیل گیا لیکن یہ اس کے

---

[1]..... (پیامِ امام امیر المؤمنینؑ) (شرح نہج البلاغہ - جعفری) (نفحات الولایۃ فی شرح نہج البلاغۃ)

بڑھنے کی آخری حد نہیں ہے، کیا اس سے اور زیادہ نہیں پھیل سکتا ہے؟ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پھیل سکتا ہے، پوری کائنات کی وسعت تک پھیل سکتا ہے۔ لہٰذا خداوند متعال نے اس کو بنایا کہ یہ پوری کائنات بن جائے لیکن بجائے اس کے کہ یہ خود پھیل کر پوری کائنات کے اندازے جتنا ہو جاتا اس نے کائنات کو سمیٹ کر اپنے اندازے کا بنالیا، جیسے کہتے ہیں کہ سمندر کو کوزہ میں بند کرنا، یہ اتنا بڑا مبالغہ نہیں ہے بلکہ کائنات کو قطرے میں بند کرنا زیادہ بڑا مبالغہ ہے جو انسان نے کر دکھایا ہے۔

لہٰذا یہ قطرہ جتنا انسان پوری کائنات ہے لیکن اس کو وسعت نظر چاہیے اور وسعت نظر سے وسعت نظریہ آئے گی جو انسان کو منظر کے قریب کرے گا، کائنات ایک منظر ہے اور چھوٹے روزن سے کسی منظر کو دیکھ کر قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوسکتا کہ میری نظر سے باہر منظر کتنا وسیع ہے۔ یہ ایک طبعی بات ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر یہ کہ انسان اپنی نظر کی محدودیت کو بھی نہ سمجھ سکے اس لیے کہ بعض اوقات یہ بھی نہیں سمجھتا کہ میری نظر اتنی محدود ہے، بجائے اس کے کہ اپنی نظر کی محدودیت کا اقرار کرے وہ منظر کو ہی محدود سمجھ بیٹھتا ہے۔ پوری کائنات میں رونما ہونے والے حوادث اور واقعات بھی ایسے ہی ہیں۔

ان واقعات میں سے ایک واقعہ جو تاریخ بشری میں وقوع پذیر ہوا ہے وہ واقعۂ کربلا ہے، یہ واقعہ بھی ایک منظر ہے لہٰذا یہ منظر بھی سب کے لیے یکساں نہیں ہے یعنی سب کی کربلا ایک جیسی نہیں ہے، سب کا حسینؑ ایک جیسا نہیں ہے، ہر ایک کا الگ الگ حسین اور الگ الگ کربلا ہے۔ یہ فرق نظر کی وجہ سے پڑا ہے، جس نے بھی جس نظر سے اس منظر کو دیکھا ویسا ہی پایا۔ انسان اگر محدود نظر اور تنگ نظری کے ساتھ دیکھے اور پھر اپنی نظر پر کالی عینک بھی چڑھائے تو اس کو اس منظر میں کیا نظر آئے گا؟ یہی وجہ ہے کہ حقیقتِ قیامِ امام حسین علیہ السلام کے متعلق بہت سے اقوال اور نظریات پائے جاتے ہیں اور ہر ایک نے

اپنی دید اور نگاہ سے اس کی تفسیر کی ہے، ہم آئندہ کی ابحاث میں ان مختلف تفاسیر کی طرف اشارہ کریں گے۔ ان میں سے صحیح تفسیر کے انتخاب کے لیے بصیرت کے ساتھ ساتھ شرح صدر کی بھی ضرورت ہے۔

شرحِ صدر اور انتخابِ احسن

جیسا کہ پہلے تحریر کیا کہ ہر ایک نے اپنی نگاہ سے کربلا پہ نظر کی ہے اور اس عظیم منظر کو دیکھ کر نظریہ قائم کیا ہے، فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام کوئی نیا موضوع نہیں ہے کہ جس پر کسی نے پہلے کبھی کچھ نہ کہا ہو، فلسفہ کربلا اور اس واقعہ کے علل واسباب کے متعلق بہت کچھ کہا گیا اور لکھا گیا ہے۔ اتنی ساری آراء اور نظریات میں سے انتخابِ احسن کے لیے شرحِ صدر کی اشد ضرورت ہے۔

شرحِ صدر، قرآنی تمغہ

دوسروں کے نظریات سننے والوں کو قرآنِ کریم نے جو تمغہ عطا کیا ہے وہ کسی کو عطا نہیں کیا:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ [1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ان لوگوں کو بشارت دیں:

الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهٗ أُولٰئِکَ الَّذِيْنَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ وَأُولٰئِکَ هُمْ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝ [2]

---

[1] .....سورۂ زمر، آیہ ۱۷ [2] .....سورۂ زمر، آیہ ۱۸

جو بات کو سنا کرتے ہیں اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔

لہٰذا سننے اور ماننے میں فرق ہے، قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ہر بات مانتے ہیں بلکہ ہر بات کو سنتے ہیں لیکن ان باتوں میں سے بہترین بات کو چُن کر اس پر عمل کرتے ہیں لہٰذا یہ عظیم اعزاز ان لوگوں کو حاصل ہوا ہے کہ جو ہر بات سنتے ہیں، اس لیے کہ ہر بات سننا بھی کوئی آسان کام نہیں جس طرح ہر بات کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے تحمل اور شرحِ صدر کی ضرورت ہے، ایک وسیع سینے کی ضرورت ہے اس لیے کہ ہر بات میں، بہت ساری باتیں آتی ہیں، ان میں بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو برداشت کرنا بہت سخت ہوتا ہے۔

شرح صدر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

شرح صدر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون جیسے ستمگر اور سرکش انسان کے پاس روانہ کیا گیا تو فرمان آیا کہ

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝[1]

اب آپ فرعون کی طرف جائیں کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جاؤ اس بڑے سرکش دشمن کے پاس لیکن یاد رکھنا سخت کلمہ نہ کہنا بلکہ نرم لہجے میں بات کرنا شاید یہ ہدایت پا جائے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بھی معلوم تھا کہ میں صرف

---

[1]..... (سورۂ طٰہٰ، آیہ ۲۴) (سورۂ نازعات، آیہ ۱۷)

باتیں کرنے تو نہیں جا رہا ہوں بلکہ مجھے سننی بھی پڑے گی۔ وہ فرعون ہے کوئی معمولی آدمی تو نہیں، وہ سنے گا کم اور سنائے گا زیادہ، پھر معمولی بات بھی نہیں سنائے گا بلکہ ایسی بات سنائے گا کہ موسیٰؑ سے وہ بات برداشت نہیں ہو گی۔ لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جانے لگے تو کہا کہ خدایا! اگر میں اس حالت میں جاؤں تو پھر تو کوئی گڑبڑ ہو جائے، وہ تیرا دشمن ہے، میں اسے ہدایت دوں گا، وہ بُرا بھلا کہنا شروع کرے گا، وہ کسی چیز کا خیال نہیں رکھے گا، میں بھی بڑا سخت مزاج ہوں، یہ چیزیں مجھ سے برداشت نہیں ہوں گی۔ اب ایک طرف موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ایک طرف فرعون تو ظاہر سی بات ہے کہ بات بنے گی نہیں لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝[1]

میرے پروردگار میرا سینہ کشادہ فرما۔

اے پروردگار! تو نے اتنا سخت فریضہ میرے ذمہ لگایا ہے کہ پورے عالم میں سے مجھے چن کر فرعون کے پاس دعوتِ حق دینے کے لیے مامور کیا ہے، اس موقع پر میری چند دعائیں ہیں اگر یہ قبول ہو جائیں تو میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پہلی دعا یہ ہے کہ خدایا! میرا سینہ کھول دے، وہ جو کچھ کہے مجھے برداشت کرنے کی ہمت عطا فرما۔ ایسا نہ ہو کہ میں اندر داخل ہوتے ہی باہر نکل جاؤں اور جس مقصد کے لیے مجھے مبعوث کیا گیا ہے اسے اپنے ہاتھوں سے فوت کر دوں، یہ سب کچھ صرف میرے اس مزاج کی نظر ہو جائے اور میں اپنے مقصد تک نہ پہنچ سکوں۔ پس اے اللہ! میرے سینے کو وسیع قرار دے۔

شرح صدر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

---

[1]..... سورۂ طٰہٰ، آیہ ۲۵

وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ۝ [1]

اور میرے کام کو میرے لئے آسان کردے۔

یہ بہت سخت مرحلہ ہے لہٰذا تو اس کی سختی کو آسانی میں بدل دے،

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ۝ [2]

اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

اگر وہ سخت اور کریہہ بات کہے تو ایسا نہ ہو کہ اس ستمگار کے سامنے میری زبان میں لکنت آجائے،اے اللہ میری دعا ہے کہ میں جب اس ظالم کے سامنے جاؤں تو میری زبان رکنے نہ پائے اور حق پر چلتی رہے لہٰذا اتنے بڑے کارنامے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے شرح صدر کی دعا مانگی ہے۔جن کے سینے تنگ ہوں اور وہ ایک سے زیادہ بات نہ سننے کو تیار نہ ہوں تو ایسے حالات میں ان کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی ہے پس پہلے اپنے اندر شرح صدر پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دوسروں کو برداشت کرسکیں لیکن دوسروں کو برداشت کرنے کا معنیٰ یہ نہیں کہ وہ جو کچھ کہیں ہم مان لیں بلکہ

فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ...... [3]

اور اس میں سے بہتر کی پیروی کرتے ہیں......

ان لوگوں کی دوسری صفت یہ ہے کہ جو ہر بات سنتے ہیں پھر سننے کے بعد ان میں سے بہترین کو انتخاب کرکے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں لہٰذا ہر بات، ہر قول اور ہر کتاب انسان اس وقت پڑھے کہ

---

[1]......سورۂ طٰہٰ، آیہ ۲۶ [2]......سورۂ طٰہٰ، آیہ ۲۷ [3]......سورۂ زمر، آیہ ۱۸

جب اس میں بہترین قول انتخاب کرنے کی صلاحیت ہو، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو ہر بات سنتے تو ہیں لیکن ان میں سے بہترین بات کو انتخاب نہیں کر سکتے۔ ان کو ساری باتیں یا تو بہترین نظر آتی ہیں یا ساری باتیں غلط نظر آتی ہیں۔ لہٰذا شرحِ صدر کے ساتھ ساتھ بہترین قول کو اپنانے کی صلاحیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

شرحِ صدر، ھدایت پانے کا اصول

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ایک ضابطہ بیان کرنے کے ساتھ اس کا مصداق بھی بیان فرمایا ہے اور وہ ضابطہ اور قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بھی ہدایت کرنا چاہے پہلے اس کو شرح صدر عطا کر دیتا ہے،

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَّهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ أَنْ يُّضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ..... [1]

پس جسے اللہ ہدایت بخشنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو.....

لہٰذا شرحِ صدر ہدایت پانے کے اصولوں میں سے ہے، اس کے برعکس اگر انسان گمراہ ہونا چاہے تو پہلے اس میں تنگ نظری اور ضیق صدر آجاتا ہے۔ تنگ نظری اور تنگ دلی ضلالت کی علامت ہے

---

[1]..... سورۂ انعام، آیہ ۱۲۵

اور شرح صدر ہدایت کی علامت ہے، یہ قانون کلی ہے اور اس کا نمونہ یہ ہے کہ:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۝ [1]

کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کا سینہ کشادہ نہیں کیا؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے کہ کیا ہم نے آپؐ کو شرح صدر عطا نہیں کیا۔ یہاں ہدایت بھی بقدرِ شرحِ صدر ہے۔

خلاصہ یہ کہ فلسفۂ کربلا اور مقصدِ قیامِ سید الشہداء علیہ السلام کو سمجھنے کے لئے شرحِ صدر ضروری ہے ورنہ دوسری صورت میں انسان اس مقدس قیام سے ہدایت نہیں پا سکتا۔

---

[1] ..... سورۂ انشرح، آیہ ۱

دوسری فصل:

قیامِ امام حسین علیہ السلام کی

تفسیر میں دشواریاں

قیام امام حسین علیہ السلام آیتِ قرآنی کی طرح محتاج تفسیر ہے البتہ اصل میں ہم محتاج ہیں کہ اس کی تفسیر کریں چونکہ صحیح تفسیر کے بغیر اس کی گہرائی اور عمق تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ دوسری جانب سے ہر ایک نے اپنے ذہن اور فکر کے مطابق اس قیام کے علل واسباب پر روشنی ڈالی ہے لہٰذا اس عظیم قیام کے متعلق بہت زیادہ تفاسیر کی گئی ہیں۔ البتہ اس عظیم قیام کی صحیح تفسیر کرنا کوئی آسان کام بھی نہیں کیونکہ اس کی تفسیر کرتے ہوئے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

قیام امام حسین علیہ السلام کی تفسیر میں دشواریاں

◂◂ مختلف آراء اور نظریات

قیام کربلا کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے اور جس موضوع کے متعلق بہت کچھ کہا جائے یا بہت کچھ کہنے کے لیے ہو تو اس کی صحیح تفسیر کرنے میں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں، بعض بزرگ مصنفین کا بہت ہی قیمتی اور گراں بہا جملہ ہے کہ ''بعض چیزوں کو سمجھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی تصنیفات وتفاسیر ہیں جو اس موضوع پر لکھی گئیں ہیں''۔ مثلاً قرآن مجید کو سمجھنے میں بہت ساری رکاوٹیں ہیں جیسے قرآن کو ہاتھ نہ لگانا، عربی سے آشنا نہ ہونا، مطالعے کی عادت نہ ہونا اور وہ علوم جو انسان کو قرآن فہمی پر قادر بناتے ہیں ان سے آشنا نہ ہونا، یہ ساری رکاوٹیں قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ہمیں درپیش ہیں لیکن سب سے بڑی اور انوکھی مشکل جو قرآن فہمی میں سب کو درپیش ہے حتیٰ کہ علماء، اہلِ مطالعہ اور اہلِ تحقیق کو بھی یہی

مشکل درپیش ہے وہ قرآن کریم کی مختلف تفاسیر ہیں، قرآن کریم کی جو تفاسیر کی گئی ہیں وہ خود قرآن کریم کو سمجھنے میں بڑی رکاوٹ ہیں اور یہی مشکل واقعۂ کربلا کے متعلق بھی سب کو درپیش ہے۔

لہٰذا انسان کسی حقیقت تک پہنچنے کے لیے جہاں بہت ساری رکاوٹوں کو عبور کرتا اور پھلانگتا ہے وہاں پر ان آراء ونظریات اور تفاسیر کو بھی عبور کرنا ضروری ہے۔ کسی بھی زبان کو دیکھیں، کسی ماحول اور معاشرے میں جائیں تو تاریخی واقعات میں سب سے زیادہ زیر بحث موضوع یہی واقعۂ کربلا ہوگا، اس کے بارے میں ہر روز نئی باتیں سننے میں آئیں گی۔ اس سے متعلق مختلف اقوال، اشعار، آراء اور نظریات سب رکاوٹ بن کر ہمارے سامنے حائل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو ان ہی کاموں میں مشغول اور سرگرم ہو کر اپنے آپ کو قانع کر لیتے ہیں کہ یہی حقیقت ہے جو ہم نے پالی لیکن کچھ لوگ اس سے ماورا جو حقیقت موجود ہے اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عامۃ الناس سے مربوط ہونا

ایک اور دشواری جو اس واقعہ کی تفسیر کے مقام پر پیش آتی ہے اور جو اپنی جگہ پر ایک آفت بھی ہے یہ ہے کہ جو چیز عامۃ الناس سے مربوط ہو اس چیز میں انحراف اور تحریف کے پہلو کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ عوامی نوعیت کے امور اس طرح کے ہوتے ہیں کہ ان میں عوامی اظہارِ رائے اور عوامی فکر ونظر کا میدان کھل جاتا ہے۔ کربلا سے ہٹ کر دوسرے امور بھی عوامی ہونے اور عامۃ الناس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بہت سارے مسائل کا شکار ہیں جیسے خود دین ہے، کربلا دین کا ایک حصہ ہے تو کُل دین بھی عامۃ الناس سے مربوط ہے، دین کسی خاص قبیلے کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے ہے، یہ عمومی چیز ہے

اسی وجہ سے جب کسی دینی ذمہ داری کی بات آتی ہے تو یہ محاورہ بھی سننے میں آتا ہے کہ کوئی دین کا ٹھیکیدار نہیں ہے اور صحیح بھی کہتے ہیں، کوئی بھی دین کا ٹھیکیدار نہیں ہے۔ قرآن نے کسی جگہ نہیں کہا ہے کہ دین فلاں اور فلاں کے لیے ہے بلکہ فرمایا کہ

هُدًى لِّلنَّاسِ..... [1]

جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے.....

اب یہ اپنی اپنی ہمت کی بات ہے کہ یہ دین جو سب کے لیے ہے اس میں سے ہر ایک اپنا حصہ حاصل کرے۔ لہٰذا دین سب کے لیے ہونے کی وجہ سے بہت ساری مشکلات کا شکار بھی ہوا۔ اگر یہ سب کیلئے نہ ہوتا تو شاید اس کو اتنی زیادہ مشکلات بھی درپیش نہ ہوتیں جیسا کہ بہت سارے علوم اور شعبے ایسے ہیں جو سب کے لیے نہیں ہیں اسی لیے وہ ایسی مشکلات کا شکار بھی نہیں ہوئے، ان چیزوں میں اتنے اختلافات اور جھگڑے نہیں ہیں مثلاً علم ریاضی کا تعلق ایک خاص طبقہ سے ہے لہٰذا اس میں اتنے اختلافات بھی نہیں ہیں۔ دین میں فرقہ واریت ہے لیکن ریاضی میں فرقہ واریت نہیں۔ ایک ریاضی دان دوسرے ریاضی دان کے قتل کا فتویٰ نہیں دیتا کہ ہم نے ریاضی کا فارمولا یوں لکھا ہے اور جو ہمارے اس لکھے ہوئے فارمولے سے متفق نہیں وہ ہمارے نظریے کا مخالف ہے۔ ابھی تک ایسا نہیں ہوا اور اگر کوئی کرے بھی تو لوگ سمجھیں گے کہ شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے لہٰذا اس جیسے علوم میں فرقہ واریت کی گنجائش نہیں ہے لیکن سیاست میں ایسا ہوتا ہے۔ سیاست میں دھڑے بندیاں اور گروہ

---

[1]..... (سورۂ بقرہ، آیہ ۱۸۵) (سورۂ آلِ عمران، آیہ ۴)

سازیاں ہیں یعنی جو کچھ دین میں ہوتا ہے وہی کچھ کم وبیش سیاست میں بھی ہوتا ہے۔ سیاست اور دین کی وجہ مشترک یہ ہے کہ دونوں عوامی ہیں دونوں عامۃ الناس سے تعلق رکھتے ہیں۔

ریاضی ایک خاص طبقے کا علم ہے وہ طبقہ اتنی سوجھ بوجھ رکھتا ہے کہ ہمیں اس علم کو کیسے حاصل کرنا چاہیے؟ اس سے کیسے فائدہ اٹھانا چاہیے؟ اس کو کیسے پھیلانا چاہیے؟ اگر اختلاف ہوا تو اسے کیسے برداشت کرنا چاہیے؟ بلکہ اس کو کیسے حل کرنا چاہیے؟! لیکن دیندار اور سیاست مدار دونوں اس طرح سے نہیں سوچتے، ایسا نہیں ہے کہ ان کی باتیں علمی نہیں ہوتی ہیں، دینی اور سیاسی باتیں بھی علمی ہوتی ہیں لیکن فرق صرف یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں عامۃ الناس سے تعلق رکھتی ہیں، سیاست اور دین میں ایک دھڑا عوام کا ہے۔

جب کسی چیز کا تعلق عوام سے ہوتا ہے تو پھر اس میں بہت ساری چیزوں کی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں عوام کا خیال رکھنا پڑتا ہے لیکن عوام ایسا فریق ہے کہ کسی چیز کا خیال نہیں رکھتے، دوسرے ان کی ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں، ان کی مرضی، ان کے شوق اور ان کے احساسات و جذبات کا خیال رکھتے ہیں لیکن عوام کسی چیز کا خیال نہیں رکھتے۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ جب کسی چیز کو عوامی معیاروں کے مطابق پیش کیا جاتا ہے تو خواہ نخواہ اس میں تحریفات، اختلافات، کئی اقوال، کئی رنگ، کئی چیزیں اور کئی شکلیں آجاتی ہیں کیونکہ عوام ایک رنگ کے نہیں ہوتے بلکہ کبھی کسی رنگ میں ہوتے ہیں تو کبھی کسی اور رنگ میں، لہٰذا بعض چیزوں کے لیے عوامی ہونا خطرناک ہے اگر کسی چیز کو بچانا ہے تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو عام لوگوں سے اور عوامی ہونے سے بچایا جائے لیکن دین اور سیاست کی تو مجبوری ہے کہ یہ عوام سے نہیں بچائے جاسکتے کیونکہ ہم دین کو کسی کمرے یا جلد وغلاف میں بند نہیں رکھ

عامۃ الناس سے مربوط ہونا

سکتے، اگر چہ چند لوگوں نے دین کو مدرسوں، عبادت گاہوں اور مساجد میں محبوس کرنے کی کوششیں کی ہیں تا کہ یہ گلیوں اور گھروں کا رخ نہ کر سکے لیکن انہیں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

اتنی بڑی بڑی قلعہ نما بلڈنگز بنائی گئی ہیں تا کہ ان میں نہ کوئی آسکے اور نہ جا سکے، ان کا نام بھی دینی مرکز رکھا گیا ہے تا کہ دین یہاں قید رہے لیکن پھر بھی دین میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ ایسے قلعوں کو عبور کر کے لوگوں کے دلوں تک پہنچ جاتا ہے۔ لہٰذا دین عامۃ الناس کیلئے ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں کہ لوگوں سے متاثر نہ ہو، جس طرح سے دین لوگوں کے لیے موثر بھی ہے تو ان سے تاثر بھی قبول کر لیتا ہے۔ سیاست بھی ایسی ہے کہ عام لوگوں سے اثر بھی لیتی ہے اور لوگوں کو متاثر بھی کرتی ہے۔ لہٰذا دین میں جو اختلافی مسائل پیش آئے ہیں ان میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دین ایک عوامی چیز ہے، عوام کو اس میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، عوام کی خوشنودی اور مرضی نیز ان کے احساسات و جذبات محترم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا دین کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہے تو پھر دونوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔

عامۃ الناس سے مربوط ہونا

تاریخ میں بھی ایسے نمونے ہیں کہ جہاں پر فریقین کا خیال رکھا گیا ہے، کبھی دین کو عوام کے تابع اور کبھی عوام کو دین کے تابع بنایا گیا یعنی جو حالات کا تقاضا تھا اس کے مطابق تجاویز دی گئی ہیں، اسی وجہ سے دین میں متشتت و مختلف آراء اور پراگندہ نظریات کا ڈھیر پایا جاتا ہے۔

جن مشکلات سے دین کا سروکار ہے وہی مشکلات قرآن کریم کے لیے بھی ہیں، چونکہ یہ ایک عوامی کتاب ہے کہ جس کا تعلق تمام لوگوں سے ہے، یہ...... "ھُدًی لِّلنَّاسِ"...... ہونے کی وجہ سے مختلف تفاسیر و تاویلات کا شکار ہوا ہے۔ جو کتابیں عوامی نہیں ہیں ان میں اتنی پریشانیاں بھی نہیں ہوتیں مثلاً کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے کہ ایک

خاص طبقہ سے متعلق ہوتی ہیں اور وہ طبقہ خود کو اس حد تک پہنچاتا ہے کہ جہاں اظہارِ رائے کی ضرورت ہو تو اظہارِ رائے کرتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں لیکن دین میں ایسا نہیں ہے بلکہ یہاں پر ہر ایک اظہارِ رائے کا حق رکھتا ہے، اگرچہ اظہار رائے کرنا ہر ایک کا حق ہے لیکن اس کا ایک معیار ہونا چاہیے۔ اس معیار کے مطابق ہر ایک کو حق ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے جبکہ دوسرے شعبوں میں ایسا نہیں ہے مثلاً طبابت میں ہر ایک اپنی رائے نہیں دے سکتا، صرف وہ شخص رائے دے سکتا ہے جو رائے دینے کے قابل ہو، یہ ایک عمومی اور تسلیم شدہ قاعدہ ہے لیکن دین اور سیاست میں یہ قاعدہ نہیں چلتا، دین میں ہر ایک مجتہد ہے، ہر ایک متکلم اور فقیہ بھی ہے۔

وہ چیزیں جو دین کا حصہ ہیں ان کا بھی یہی حال ہے مثلاً قیامِ کربلا کا تعلق چونکہ **عامۃ الناس** سے بھی ہے لہٰذا یہ موضوع بھی اختلاف اور تفرقہ کا شکار ہوا۔ چونکہ کربلا سب کی ہے اور امام حسین علیہ السلام بھی سب کے ہیں اسی لیے آپ کو امام الناس کہتے ہیں اور سب سے مربوط ہیں۔ لہٰذا اس عظیم قیام کی تفسیر بھی وہی حشر ہوا جو دین کا ہوا اور اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا عامۃ الناس سے متعلق ہونا ہے۔ لہٰذا عوام سے تعلق کبھی آفت کے طور پر بھی رونما ہوتا ہے، یوں بھی نہیں کہ اختلافات اور تفرقہ سے بچنے کے لیے یہ کام کیا جائے کہ یہ قیام عوامی نہ رہے اور عامۃ الناس سے اس کا تعلق ختم ہو جائے، بلکہ یہ عوامی ہی رہے لیکن اظہارِ رائے کے لیے ایک معیار مقرر ہونا چاہیے۔ رائے کے معیار کے ساتھ اظہارِ رائے کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن عوام اس قاعدے اور معیار کا بھی خیال نہیں رکھتے ہیں لہٰذا کربلا جیسے عظیم واقعات صرف اقوال کا شاہکار رہ گئے ہیں۔

اس عظیم قیام پر مفکرین اور دانشوروں کے تمایلات، احساسات و جذبات اور رجحانات مختلف

عامۃ الناس سے مربوط ہونا

ہیں،ایک احساساتی آدمی نے اس کو احساسات کے زاویہ سے دیکھا ہے جبکہ ایک خیالاتی آدمی نے اسے تخیل کے زاویہ سے دیکھا ہے،جس طرح کا کوئی رجحان اور ذوق رکھتا ہے اس نے اسی انداز اور زاویہ سے اس پر اظہارِ خیال کیا ہے،علاوہ ازیں عرفاء نے عرفانی رنگ سے،فلاسفہ نے فلسفی پہلو سے اور ماہرینِ عمرانیات نے اسے اجتماعی پہلو سے دیکھا ہے لہٰذا کربلا کی تفسیر میں بہت زیادہ آراء اور نظریات پائے جاتے ہیں اور یہ نظریات کربلا فہمی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہیں۔

تیسری فصل:

قیام سید الشہداء علیہ السلام کی مختلف تفاسیر

واقعۂ کربلا ایک عظیم آیتِ الٰہی ہے کہ جس کے کئی پہلو ہیں۔ظاہری و تاریخی پہلو بھی ہے اور باطنی و حقیقی پہلو بھی،اس کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ سیاسی و اجتماعی پہلو بھی رکھتا ہے،غرض دسیوں پہلواس واقعہ کے اندر موجود ہیں۔شہید مطہریؒ کے بقول اس مختصرسی جنگ میں نہ ختم ہونے والا مضمون موجود ہے۔ واقعۂ کربلا کو بھی قرآنی آیات کی طرح تفسیر وشرح اور دقیق تجزیہ وتحلیل کی ضرورت ہے۔اس کے بغیر کربلا کے اسرار اور قیامِ امام حسین علیہ السلام کے حقائق انسان کو معلوم نہیں ہو سکتے۔چنانچہ حادثہ کربلا سے لے کر آج تک بہت زیادہ افراد نے اس واقعہ کی مختلف تفاسیر بیان کی ہیں۔ان تمام تفاسیر وتحلیلات کو اگر اکٹھا کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں وجود میں آجائیں۔شیعہ علماء و محققین کے علاوہ اہلِ سنت کے علماء حتیٰ بعض غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس واقعہ کا تجزیہ کیا ہے بعینہٖ جیسے قرآن کریم کی آج تک متعدد اور مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ان متعدد تفاسیر میں سے ہم اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقط بیس اہم قابلِ ذکر نظریات کا تذکرہ کریں گے اور آخر میں کربلا کی صحیح تفسیر کی طرف اشارہ کریں گے۔

مطالبۂ بیعت

۱۔ مطالبۂ بیعت

واقعۂ کربلا کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ یہ واقعہ یزید کے مطالبۂ بیعت کو ٹھکرانے کے نتیجہ میں رونما ہوا ہے۔تاریخی لحاظ سے یہ ثابت ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام اور امیر شام کے درمیان صلح کے عہد نامہ میں یہ طے پا گیا تھا کہ جب تک امیر شام زندہ ہے اسے حکومت کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اپنے

بعد کسی کو اپنا جانشین نہیں بنا سکتا۔ اس عہد نامے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے معاویہ نے بعض ساتھیوں کے مشورے سے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ امیر شام نے اپنی موجودگی میں یزید کے لیے لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دی۔ مدینہ میں بھی بیعت لینے کا عمل شروع ہوا لیکن بہت سی شخصیات نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ معاویہ نے مرتے وقت یزید کو بعض سرکردہ شخصیات کی جانب سے مخالفت کا عندیہ دے دیا تھا اور ان میں سید الشہداء علیہ السلام کی جانب سے مخالفت پر اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ امیر شام نے شدید تمایل کے باوجود مذکورہ شخصیات سے بیعت لینے کے لیے طاقت کے استعمال سے اجتناب کیا۔ ۶۰ھ میں معاویہ کے مرنے کے بعد یزید تخت نشین ہوا۔ اقتدار میں آتے ہی یزید نے مدینہ کے والی ولید بن عقبہ کو خط لکھا کہ فوراً اہل مدینہ سے بیعت لے اور اس خط میں خصوصیت کے ساتھ امام حسین علیہ السلام سے بیعت لینے پر تاکید کی۔ خط میں یہ صراحت کر دی گئی تھی کہ اگر وہ بیعت سے انکار کریں تو اس صورت میں سر تن سے جدا کر کے شام روانہ کر دو۔

مطالبۂ بیعت

چنانچہ ولید نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو دارالامارہ میں طلب کیا۔ حضرت سید الشہداء علیہ السلام یہ بھانپ گئے کہ امیر شام مر گیا اور مجھے یزید کی بیعت کے لیے بلایا جا رہا ہے لہٰذا حضرت امام حسین علیہ السلام چند ہاشمی جوانوں کے ہمراہ دارالامارہ گئے اور ان سے مخاطب ہوئے کہ مجھے لگتا ہے تمہارا امیر مر گیا ہے، ولید نے معاویہ کی موت کی خبر کی تائید کر دی اور ساتھ ہی یزید کا خط بھی سنایا کہ جس میں صراحت کے ساتھ بیعت کا مطالبہ موجود تھا۔ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ تنہائی میں بیعت تمہارے لیے سودمند نہیں ہے، کل تم سب کو اکٹھا کر و لوگوں کے سامنے یہ عمل انجام پانا چاہیے۔ مروان بن حکم جو کہ ولید کے مشاور کی حیثیت سے دربار میں موجود تھا فوراً بول پڑا کہ ولید اگر یہ فرصت تیرے ہاتھ سے نکل گئی تو پھر حسینؑ بن علیؑ پر قابو

نہ پاسکو گے لہٰذا ابھی یا بیعت لے لو یا پھر سر قلم کر دو۔ امام علیہ السلام نے مروان کے گستاخانہ اظہارات کے جواب میں فرمایا:

يَا بْنَ الزَّرْقَاءِ اَنْتَ تَقْتُلُنی اَمْ هُوَ كَذِبْتَ وَاَثِمْتَ؟.....[1]

اے زرقا کے بیٹے! مجھے تو مارے گا یا ولید؟ تم جھوٹ بولتے اور گناہ کرتے ہو.....

اور پھر بعد میں دربار سے باہر آ گئے۔ ایک طرف سے یہ بیعت کا صاف انکار تھا جسے مروان اور ولید سن چکے تھے، اس کے بعد امام علیہ السلام نے مدینہ سے نکلنے کا عزم کیا چونکہ مدینہ آپ کے لیے امن کی جگہ نہیں تھی۔ آپ مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے۔ حکومتی اور غیر حکومتی کارندے مکہ میں بھی مسلسل آپ کو بیعت کی ترغیب دلاتے رہے۔

مطالبۂ بیعت

جب مکہ بھی آپ کے لیے نا امن ہو گیا تو حضرت نے کوفہ جانے کا عزم کیا مگر اہلِ کوفہ کی بے وفائی کی وجہ سے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ راستے میں کوفی فوج کے ایک دستے سے مُڈھ بھیڑ ہوئی جس کا سالار حُرّ بن یزید ریاحی تھا۔ انہوں نے امام کا راستہ روکا اور پھر مطالبۂ بیعت کیا۔ امام علیہ السلام نے ایک دفعہ پھر بیعت سے انکار کر دیا۔

کربلا میں جانے کے بعد بھی جب لشکر سے آمنا سامنا ہوا تو ان کی جانب سے بھی مسلسل بیعت پر اصرار ہوتا رہا اور یہ لوگ امام علیہ السلام کی طرف سے مسلسل انکار سنتے رہے۔ چنانچہ عاشور کے دن جب کوفی لشکر کو یقین ہو گیا کہ بیعت کی کوئی عملی صورت نظر نہیں آتی تو انہوں نے جنگ کا آغاز کر دیا۔ البتہ اس

---

[1].....(موسوعۃ کلمات الامام الحسین علیہ السلام، صفحہ ۳۱۹) (سخنانِ حسین بن علی علیہم السلام از مدینہ تا کربلا، صفحہ ۱۴)

سے پہلے ہر قسم کا دباؤ ڈالا گیا تا کہ امام علیہ السلام کے عزم میں خلل ایجاد کر سکیں، اس کے بعد تا عصر عاشورا امامؑ کو اپنے ساتھیوں سمیت شہید کر دیا گیا اور آپ علیہ السلام کے خاندانِ مطہر کو اسیر بنا لیا گیا۔ اس تفسیر کے مطابق کربلا کے واقعہ کا سبب تامّ متفق الیہ بیعت اور امام علیہ السلام کا انکار کرنا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر یزید مطالبۂ بیعت نہ کرتا اور اپنے باپ کی طرح ظاہری رواداری سے کام لیتا یا کوئی اور درمیانی راستہ نکل آتا تو ہرگز یہ ناگوار و دردناک سانحہ رونما نہ ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں اگر یزید امام حسین علیہ السلام کو نہ چھیڑتا تو امامؑ کو بھی اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جس طرح اس سے پہلے آپ علیہ السلام کے خاندان کا معاویہ سے کوئی سروکار نہیں تھا پس یہ قیام محض مطالبۂ بیعت کا ایک ردعمل ہے۔ یہ تفسیر سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی قبول کی ہے۔

اہل کوفہ کی دعوت

۲۔ اهل کوفه کی دعوت

کربلا اور قیام سید الشہداء علیہ السلام کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اگرچہ کربلا کے کئی مناظر ہیں اور کئی عناصر اس میں موجود ہیں لیکن جس عنصر یا عامل کو اس واقعہ کا سبب تام اور اصلی محرّک قرار دیا جا سکتا ہے وہ اہلِ کوفہ کی دعوت اور پھر اپنے عہد سے بے وفائی ہے۔ کوفہ امیر المومنین علیہ السلام کے عہد میں حکومت کا مرکز رہا ہے اسی وجہ سے اس شہر میں مولا علی علیہ السلام اور آپ کے خاندان سے عقیدت رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ ان میں سے اکثر امیر المومنین علیہ السلام کی فوج میں امیر شام کے خلاف جنگ بھی لڑ چکے تھے۔ کوفیوں کے دلوں میں امیر شام کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی لہٰذا معاویہ نے اپنے دورِ حکومت میں کبھی بھی کوفہ سے غفلت نہیں برتی اہلِ کوفہ کے لیے بھی یزید کا تخت نشین ہونا اور اقتدار میں آنا ناگوار تھا۔ چنانچہ جب

انہیں معلوم ہوا کہ سید الشہداء علیہ السلام نے بھی بیعت نہیں کی اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں قیام پذیر ہیں تو انہوں نے کوفہ میں مخفیانہ طور پر سرکردہ لوگوں کو اکٹھا کیا اور بعض معروف شخصیات کے گھروں میں ملنا شروع کر دیا۔ سب نے اتفاق سے طے کیا کہ امام حسین علیہ السلام کو کوفہ آنے کی دعوت دی جائے پھر جب امام علیہ السلام آئیں تو ان کا بھرپور ساتھ دیا جائے اور کوفہ میں حکومت قائم کر کے شام کا مقابلہ کیا جائے۔ لہٰذا تاریخی شواہد کے مطابق اہلِ کوفہ نے امام حسین علیہ السلام کی طرف خطوط لکھنا شروع کئے اور اپنے قاصد روانہ کئے، ایک تاریخی سند کے مطابق اہلِ کوفہ نے امام علیہ السلام کو اٹھارہ ہزار خطوط ارسال کئے جنہیں امام علیہ السلام اپنے ہمراہ کربلا بھی لے گئے تھے۔ امام علیہ السلام کو جب یہ خطوط موصول ہوئے تو آپؑ نے اپنے چچازاد بھائی جناب مسلم بن عقیلؑ کو اپنا سفیر اور نمائندہ بنا کر کوفہ روانہ کیا تا کہ کوفہ کے حالات کا بھی جائزہ لیں۔ کوفیوں سے بیعت بھی لیں اور پھر امام علیہ السلام کو آگاہ کریں۔

اہل کوفہ کی دعوت

مسلم بن عقیل علیہ السلام کوفہ روانہ ہو گئے، سفیر امامؑ نے کوفہ پہنچتے ہی مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کیں، سرکردہ افراد سے بات چیت کی اور کوفیوں سے بیعت لی، ایک قول کے مطابق مطابق اٹھارہ ہزار کوفیوں نے سفیر امامؑ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یزید کو جب کوفہ میں مسلم بن عقیلؑ کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو اس نے بصرہ سے عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ جانے کا حکم دیا اور ساتھ کوفیوں کی شورش کی سرکوبی کا حکم بھی صادر کیا، عبید اللہ جب کوفہ آیا تو اس نے کوفیوں کی نفسیات سے آگاہی رکھتے ہوئے تند مزاجی کا مظاہرہ کیا اور اس کا یہ حربہ نہایت مؤثر واقع ہوا۔ چنانچہ کوفی عبید اللہ کے خوف سے مسلم بن عقیلؑ سے دور ہونا شروع ہو گئے اور سفیر امام علیہ السلام کو تنہا چھوڑ دیا۔

دوسری طرف سے مسلم بن عقیل علیہ السلام نے کوفیوں کا ظاہری حال دیکھ کر امام حسین علیہ السلام کو خط لکھ

بھیجا اور اس میں امام علیہ السلام سے چاہا کہ کوفہ آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے جلدی آجایئے۔ امام علیہ السلام کو جب مسلم بن عقیل علیہ السلام کا خط ملا تو مکہ سے کوفہ جانے کا ارادہ کیا۔ بعض ہمدردوں نے مکہ میں آپ کو کوفہ جانے سے روکا اور کوفیوں کی بدعہدی اور بے وفائی کی طرف امامؑ کی توجہ دلائی لیکن امام علیہ السلام نے ان کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے کوفہ کا رخ کیا۔ جب کوفہ کے قریب پہنچے تو ایک مسافر سے کوفہ کے حالات معلوم ہوئے، فرزدق نے امام علیہ السلام کو بتایا کہ اہل کوفہ کے دل آپ کے ساتھ اور تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔ امام علیہ السلام نے وہاں سے اپنا راستہ ایک نامعلوم مقام کی طرف موڑ لیا جو بعد میں کربلا جا کر منتہی ہوا۔

اس تفسیر کے مطابق اگرچہ دو عوامل بھی اس واقعہ کے اندر موجود ہیں لیکن سب سے بڑا اور مرکزی عامل اہلِ کوفہ کا امام علیہ السلام کو دعوت دینا، امام کا ان پر اعتماد کرنا اور پھر ان کی بدعہدی و بے وفائی ہے۔ اگر اہلِ کوفہ دعوت نہ دیتے یا پھر دعوت دے کر اپنے عہد سے نہ پھرتے تو یقیناً واقعہ کربلا رونما نہ ہوتا۔ چونکہ اس صورت میں امام علیہ السلام کوئی اور چارہ جوئی کرتے یا مکہ میں رُک جاتے یا مدینہ لوٹ جاتے یا پھر مکہ میں موجود سرکردہ افراد آپؑ کے اور یزید کے مابین وساطت کر کے کوئی راہِ حل نکال لیتے۔

۳۔ تقدیر اور قسمت

تیسری تفسیر جو بہت مشہور ہے اس بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے یہ تفسیر نہیں سنی اس لیے کہ ہماری تصدیق کا منبع شہادت دیتا ہے کہ یہ تفسیر کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ قسمت ہی یہی تھی، تقدیر میں یہی لکھا ہوا تھا۔ جیسا کہ ہر ایک کی پیدائش سے پہلے اس کی سرنوشت اور تقدیر خدا نے لکھ دی ہے، انبیاء علیہم السلام و ائمہ معصومین علیہم السلام، ان کی اولاد اور فرداً فرداً مسلم و کافر سب کی تقدیر میں جو کچھ آئندہ

رونما ہونے والا ہے وہ پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ قضاوقدر کے معانی یہی ہیں کہ پیدائش سے پہلے سب کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ آپ نے شہید ہونا ہے، آپ نے زخمی ہونا ہے، فلاں نے گمراہ ہونا ہے، فلاں نے ہدایت پانی ہے، وہ شخص کامیاب رہے گا، یہ شخص ناکام رہے گا، یہ قاتل ہوگا، وہ مقتول ہوگا، یہ اسیر ہوگا، وہ آزاد ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہر ایک کی قسمت میں، ہر ایک کی پیشانی پر پہلے سے لکھا ہوا ہے یہی تقدیر اور قسمت ہے۔ تقدیر کے آگے کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے۔ تقدیر کو کون بدل سکتا ہے؟ تقدیر کب بدل سکتی ہے؟ تقدیر کا لکھا ضرور مل کے رہتا ہے لہٰذا کربلا کا یہ سارا واقعہ تقدیر کا کھیل تھا۔

یہ وہ تفسیر ہے جس پر اکثریت کا یقین ہے، خصوصاً اہلِ منبر بعض اوقات سوچ سمجھ کے اور بعض اوقات بغیر سوچے سمجھے کہہ جاتے ہیں کہ یہ تقدیر میں لکھا ہوا تھا۔ بعض لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت زینب علیہا السلام نے شبِ عاشورا اپنی گفتگو میں بھی یہی فرمایا کہ بہن نے بھائی سے کہا ''بھیا یہ تیری قسمت اور یہ میری قسمت'' اور قسمت پر دونوں راضی ہیں۔ اس تفسیر کے لیے دوسری دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ جملہ ہے کہ جو آخری وقت امام حسین علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا:

رضا بقضائک و تسلیما لامرک و لا معبود سواک یا غیاث المستغیثین..... [1]

تیری قضا پر راضی ہوں اور تیرے حکم کے سامنے تسلیم ہوں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اے فریادرسوں کے فریادرس!

---

[1]..... (حماسۂ حسینیؑ، جلد ۱، صفحہ ۲۹۶) (امام حسین علیہ السلام از زبان شہید مطہریؒ)

کہتے ہیں کہ اس جملہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تقدیر کا مسئلہ تھا۔امام حسین علیہ السلام نے بھی تقدیر کے حکم کو قبول کیا اور قبول کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا یعنی امام حسین علیہ السلام مجبور تھے ان کے پاس کوئی اور اختیار و انتخاب نہیں تھا۔

یہ بہت پرانی تفسیر ہے بلکہ ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سب سے قدیم ترین تفسیر جو کربلا کی گئی تھی وہ یہی ہے کہ جس زمانے میں یہ واقعہ رونما ہوا تو لوگوں نے فلسفۂ کربلا بھی ساتھ ہی بیان کیا، یعنی بنی امیہ جو کہ اس دور کے حکمران تھے اور اس واقعہ کے ذمہ دار ہیں انہوں نے اپنے دامن کو صاف کرنے کے لیے یہ رائج کیا کہ یہ تقدیر کی بات تھی، یہ قضاء وقدر الٰہی ہے لہٰذا اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ خدا کے حکم کے بغیر تو پتّہ بھی حرکت نہیں کرسکتا، خدا نے اپنی قدرت جو اس عالم میں ظاہر کی ہے تو خدا کی قدرت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا، نہ ہوا چل سکتی ہے اور نہ پرندہ اڑ سکتا ہے حتیٰ کہ پتّہ بھی نہیں ہل سکتا تو اتنے بڑے شمر لعین نے کیسے تقدیر کے لکھے بغیر یہ عمل انجام دیا، عمر بن سعد کا اتنا بڑا لشکر کیسے ہل گیا؟ عام اور سادہ لوگ جب یہ بات سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بات تو ٹھیک ہے کہ جب خدا کے حکم کے بغیر پتّہ بھی حرکت نہیں کرسکتا تو اتنا بڑا لشکر کیسے اس کام پر آمادہ ہوا؟ پس اس میں ضرور خدا کا حکم تھا۔اب جب خدا کا حکم تھا تو اس میں بنی امیہ کے حکمرانوں کا کیا قصور تھا؟ پتّہ اگر حرکت کر رہا ہے تو خدا کے حکم سے کر رہا ہے لہٰذا اس میں پتّے کا کیا قصور ہے؟ اس لئے اگر یہ کام بنی امیہ نے کیا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے، پس یہ تفسیر بنی امیہ نے پیش کی اور پھر لوگوں کو خریدا کہ وہ منبروں پر یہی تفسیر بیان کریں۔ لہٰذا سب سے پہلے بنی امیہ کی طرف سے مامور تنخواہ خوار خطباء، ائمہ جمعہ اور اہل منبر کی زبان پر یہی تفسیر چڑھی اور انہوں نے لوگوں کے سامنے یہ بیان کرنا شروع کیا کہ یہ قضا وقدر کی بات تھی، یہ تو تقدیر اور

قسمت کا فیصلہ تھا۔ ایک کی قسمت میں مارنا اور دوسرے کی قسمت میں مرنا لکھا ہوا تھا، مارنے والا مارنے پر مجبور تھا اور مرنے والا مرنے پر۔ یہ تفسیر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہوئے آگے بڑھتی رہی، ہر دور اور ہر عصر میں اس تفسیر کو خوب بیان کیا گیا، یہ ان علوم کی طرح ہے جن کے لئے کہتے ہیں کہ یہ کتابی علوم نہیں بلکہ صدری علوم ہیں۔ حتیٰ کہ یہ تفسیر ان لوگوں نے بھی بیان کرنا شروع کی جو واقعۂ کربلا پر احتجاج کرتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ بنی امیہ نے ظلم کیا۔ لہٰذا ایک طرف سے بنی امیہ کو ظالم مانتے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ یہ قسمت میں لکھا ہوا تھا، ان کے مطابق بنو امیہ اور امام حسین علیہ السلام دونوں مجبور تھے۔ یہ دو متضاد باتیں ہو جاتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی ہیں، اگر ظالم کی تقدیر میں ظلم کرنا لکھا ہوا تھا اور مظلوم کی تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ اس پر ظلم کیا جائے اور تقدیر بھی کسی نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھی گئی تو اس صورت میں بنی امیہ بالکل بے قصور ہیں۔ لہٰذا ظالم کے دامن کو صاف کرنے کے لیے بہترین تفسیر یہی تقدیر والی تفسیر ہے۔

٤۔ شهادت اور لقاء الله

یہ ایک عرفانی تفسیر ہے۔ گویا یہ تفسیر ذوقِ عرفانی رکھنے والے لوگوں نے کی ہے، جیسا کہ ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں کہ انسان جس عینک سے دیکھے اس کو باہر کی فضا ویسی ہی نظر آتی ہے جیسا اس کی عینک کا رنگ ہے۔ لہٰذا دیدِ عرفانی رکھنے والوں نے اپنی اس دید کے ساتھ واقعۂ کربلا کی تفسیر کی ہے اور وہ تفسیر یہ ہے کہ یہاں پر امام حسین علیہ السلام کا اصلی مقصودِ شہادت، خدا کی بارگاہ میں جا پہنچنا اور لقاء اللہ ہے، اس حادثہ کا اصلی محرک لقاء اللہ ہے۔ پھر اس کے لیے قرآن اور غیر قرآن سے بھی شواہد پیش کئے ہیں۔ قرآن

میں ہے:

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۝ [1]

اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔

لہٰذا ہر مومن کو موت کی آرزو ہوتی ہے لہٰذا خدا کی راہ میں مر جانا امام حسین علیہ السلام کی بھی آرزو تھی۔ بس اول و آخر فلسفۂ کربلا یہی لقاء اللہ، شہادت اور خدا کی راہ میں کٹ مرنا ہے۔ شاعر مشرق اقبالؒ بھی چونکہ ذوقِ عرفانی رکھتے ہیں تو گویا ان کا بھی یہی نظریہ ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی ..... [2]

علامہ اقبالؒ کے ان اشعار میں بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ

گرچہ ہر مرگ است بر مؤمن شکر

مرگ پور مرتضٰی چیزی دگر

بندہ مومن کے لیے موت شکر سے شیریں اور مرغوب و محبوب ہوا کرتی ہے کیونکہ یہ اسے جادۂ عشق کی انتہا پر پہنچا کر اپنی اصل سے متصل کرتی ہے۔ لہٰذا بندۂ مومن موت میں حلاوت پاتا ہے مگر پور مرتضیٰؑ، امام حسین علیہ السلام کی مرگ یعنی شہادت کی بات ہی کچھ اور ہے،

علامہ آگے مزید فرماتے ہیں کہ

---

[1] ..... (سورۂ بقرہ، آیہ ۹۴) (سورۂ جمعہ، آیہ ۶)

[2] ..... [بالِ جبرئیلؑ، طارق کی دعا {اندلس کے میدانِ جنگ میں}، صفحہ ۱۰۸]

جنگ شاہاں جہاں غارتگری است

جنگ مؤمن سنت پیغمبری است

جنگ مؤمن چیست؟ہجرت سوی دوست

ترک عالم اختیار کوی دوست

آنکہ حرف شوق با اقوام گفت

جنگ را رہبانی اسلام گفت

کس نداند جز شہید این نکتہ را

کو بخون خود خرید این نکتہ را .....[1]

شاہانِ دنیا کی جنگ محض غارتگری ہوا کرتی ہے، مگر جنگ مومن سنت پیغمبری ہے، مومن کی جنگ کیا ہے؟ محبوبِ حقیقی کی جانب ہجرت، سارا عالم چھوڑ کر محبوبِ حقیقی کی ملاقات ہی مومن کی جنگ و جہاد ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کو رہبانیتِ اسلام قرار دیا ہے، یہ نکتۂ شوق شہید کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا، شہید جان دے کر اس راز کو پالیتا ہے۔ اس تفسیر کے لیے حضرت امام حسین علیہ السلام کا یہ قول بھی بہترین شاہد ہوسکتا ہے کہ

صَبْراً یا بَنِی الکِرامِ فَمَا الْمَوتُ اِلاّ قَنْطَرَۃٌ تَعْبُرُ بِکُمْ عَنِ

الْبُؤْسِ وَالضَّرّاءِ اِلَی الْجِنانِ الواسِعَۃِ وَالنِّعَمِ الدّائمۃِ..... [2]

---

[1].....(کلیاتِ اقبالؒ، فارسی، جاوید نامہ، حقیقت حیات ومرگ وشہادت) [2].....سخنان حسین بن علی (ع) از مدینہ تا کربلا

اے معزز لوگوں کی اولادو! صبر و تحمل سے کام لو۔ موت تو صرف ایک پُل ہے جس کے ذریعے تم سختی اور مشکلات سے گزر کر وسیع و عریض جنت اور اس کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں تک پہنچ جاؤ گے.....

پس یہ لوگ کہتے ہیں کہ شہادت کے لیے کربلا برپا ہوئی، اس تحریک کا اصلی فلسفہ شہید ہونا تھا لہٰذا امام حسین علیہ السلام اپنے مقصد تک پہنچ گئے۔ شہید ہونا مقصود تھا اس لئے شہید ہو گئے۔ ہر تفسیر کے آثار اور لوازم بھی ہیں یعنی یوں نہیں ہے کہ یہ بس ایک تفسیر، ایک قول اور ایک نظریہ ہے بلکہ اس نظریے کے بہت سارے لوازم بھی ہیں، نظریہ کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان لوازم اور آثار کو بھی ماننا پڑے گا مثلاً اگر آپ نے مان لیا کہ ابھی رات ہے تو یہ صرف ایک بات کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس کے بہت سے لوازم کو بھی ماننا پڑے گا کہ جو رات کے لیے ضروری ہوتے ہیں مثلاً چراغ اور روشنی کا بندوبست کرنا اس کے لوازمات میں سے ہے۔ لہٰذا اگر ہم نے کربلا کے متعلق کوئی نظریہ یا تفسیر مان لی تو پھر اس کے آثار اور لوازم کو بھی عملاً قبول کرنا پڑے گا۔

۵۔ حصولِ اقتدار

پانچویں تفسیر یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے اسلامی حکومت تشکیل دینے کے لیے قیام کیا، نہ کہ ہر قسم کا اقتدار بلکہ وہ منصفانہ اقتدار کہ جس کے ذریعے الٰہی اقدار کو حاکم کر سکیں یعنی گویا یہ ایک سیاسی معرکہ تھا کوئی عرفانی معرکہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس تفسیر والے کہتے ہیں کہ آپ یہ نہ کہیں کہ صرف شہید ہونا مقصود تھا، اس تفسیر کے مطابق شہادت مقصد نہیں تھا بلکہ انجام تھا۔ مقصد اور انجام میں فرق ہے، جیسا کہ انسان بعض اوقات کوئی چیز مقصد کے طور پر نظر میں رکھ کر آگے بڑھتا ہے، جونہی وہ چیز ہاتھ آتی ہے وہ

کامیاب ہوجاتا ہے، بعض اوقات اس شئے کے حصول میں ناکام ہوتا ہے اور انجام کچھ اور ہوتا ہے مثلاً آپ اس مقصد کے تحت صبح سویرے اٹھ کر گھر سے نکلتے ہیں کہ اپنے دفتر جا پہنچیں۔ اتفاق سے راستے میں ایکسیڈنٹ (Accident) ہو جاتا ہے، وہاں سے آپ کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے، ہسپتال پہنچنا آپ کا انجام ہوا ورنہ پہلے سے یہ مقصد نہیں تھا۔ لہٰذا اس تفسیر کے مطابق پہلے سے تعین شدہ مقصد اسلامی حکومت تشکیل دینا تھا، اتفاق سے حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے یہ حرکت شہادت پر جا کر منتہی ہوئی یعنی اس کا نتیجہ شہادت نکلا۔

یہ تفسیر کرنے والے اپنے اس مدعا میں دلائل بھی پیش کرتے ہیں، ان کے بقول امام حسین علیہ السلام کوئی کسان نہیں تھے، کسی کسان سے ان کی جنگ نہیں ہوئی، یہ بات عیاں ہے کہ کسی کسان کے ساتھ لڑائی کسی پلاٹ، کسی کھیتی کے حصول کے لیے لڑی جاتی ہے جبکہ آج کل پانی کے حصول کے لیے ہڑتالیں اور جنگیں ہو رہی ہیں، یہ بات ظاہر ہے کہ پانی کے حصول پر لڑنے والے جاگیردار اور کسان ہوں گے ورنہ جس کا پورے کراچی شہر میں ایک ہی فلیٹ ہو اور وہ بھی کرائے کا تو اسے کیا فکر ہو کہ پورے سندھ کو پانی دیا جاتا ہے کہ نہیں، اس کے نزدیک یہ بے فائدہ بحث ہے کہ پنجاب پانی پی رہا ہے اور سندھ پانی سے محروم ہے۔ ایک فلیٹ کو کتنا پانی چاہیے، ایک ٹینکر لے آؤ تو کام چل جاتا ہے، اب یہ کیا جنگ ہے کہ صوبوں میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن وہ لوگ جو جاگیردار ہیں ان کے لیے پانی کا مسئلہ نہایت اہم ہے لہٰذا وہ اس پر لڑتے ہیں۔ اسی طرح اگر میونسپل کمیٹی (Municipal Committee) کے خلاف کوئی اٹھ کر کھڑا ہو تو وہ طبقہ جو مدمقابل ہے خود ہی بتا دیتا ہے کہ یہ کس قسم کی جنگ ہے۔ اگر ٹریفک پولیس سے کوئی جھگڑا ہو گیا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ تنازعہ کس چیز پر ہے۔ اسی طرح اگر حکمرانوں سے کوئی

ٹکر لے تو یہ ٹکراؤ حکومت کے حصول کے لیے سمجھا جاتا ہے۔ اگر حکومت ان کے مدنظر نہ ہوتی تو وہ کسی اور طبقے سے جنگ کرتے۔ حکومت سے ٹکرانے کا مقصد حصول اقتدار ہی ہے۔

٦۔ فلاحی اور رفاھی اصلاح

چھٹی تفسیر یہ ہے کہ یہ ایک فلاحی اور رفاہی حرکت تھی جو امام حسین علیہ السلام نے شروع کی۔ امام حسینؑ نے جب دیکھا کہ حکومت ظلم کر رہی ہے، لوگ غریب اور فقیر ہیں، کھانے کو کچھ نہیں ملتا، پینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں جبکہ ایک طبقہ سب کچھ لوٹ رہا ہے، امیر امیر تر ہو رہا ہے اور دوسرا طبقہ فقیر ہو رہا ہے، امیر و غریب کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے تو اس فرق کو مٹانے کے لیے امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا تاکہ امت میں عدل و انصاف، مساوات اور بھائی چارے کا قیام ہو، تاکہ معاشرہ فلاح اور رفاہ کی زندگی بسر کرے۔

ہر تفسیر کے لیے ہر ایک نے اپنی اپنی دلیلیں دی ہیں، خود امام حسین علیہ السلام کے خطبات اور دیگر تاریخی شواہد سے ان تمام آراء اور نظریات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس تفسیر کے لیے بھی کہا گیا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے وصیت نامہ میں جو لفظِ ''اصلاح'' آیا ہے اس سے مراد فلاح اور رفاہِ امت ہے لہٰذا سارا قیام امت کی اصلاح یعنی ان کی فلاح، رفاہ اور بہبود کے لیے تھا، اس میں اپنا ذاتی کوئی مقصد نہیں تھا بلکہ امت پہ قربان ہو گئے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ سارا دن اپنے گھر اور اپنے خاندان کے لیے کچھ نہیں کرتے بلکہ صبح و شام ان کا کام یہ ہے کہ معاشرے کے لوگ آسودہ رہیں، آسائش میں رہیں، اچھی زندگی بسر کریں، کوئی فقیر و مسکین نہ ہو، کوئی بیمار نہ ہو، کوئی ظلم کی چکی میں نہ پس رہا ہو، کسی پہ

ستم نہ ہو، بہت سارے لوگ اس طرح کے کام کرتے ہیں جیسا کہ آج کل ہمارے ملک میں این جی اوز (NGOs) اس قسم کے فلاحی اور رفاہی کام کرتی ہیں۔

۷۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

سید الشہداء علیہ السلام کے مقدس قیام کے لیے ایک اور تفسیر یہ ہے کہ یہ قیام فقط امر بالمعروف کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر عوامل یا سرے سے بے تاثیر ہیں یا پھر ثانوی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اس قیام کا سبب تام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس کی تشریح میں یہ کہا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں امر بالمعروف کو امت اسلامیہ کی برجستہ صفت قرار دیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ...... [۱]

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لئے پیدا کئے گئے ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو......

اسلامی شریعت کی رو سے امر بالمعروف واجبات میں سے ہے بلکہ روایات میں تو یہاں تک بیان ہوا ہے کہ امر بالمعروف سب سے اساسی فریضہ ہے۔ اگر یہ فریضہ قائم ہو گیا تو سارا دین قائم ہو سکتا ہے اور اگر یہ ترک ہو جائے تو سارا دین ترک ہو جائے گا، غرضیکہ امر بالمعروف ان جملہ واجبات میں سے ہے جن پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اگر یہ فریضہ ترک کر دیا جائے تو امت اور سماج کی موت واقع

---

[۱]...... سورۂ آلِ عمران، آیہ ۱۱۰

ہو جاتی ہے، البتہ اس کی اپنی خاص شرائط اور خصوصیات ہیں جیسا کہ اس کے خاص مراتب بھی ہیں۔

امر بالمعروف کا سب سے ادنیٰ مرتبہ دل سے معروف اور اچھی اقدار سے محبت کرنا اور منکرات وفساد سے بیزار ہونا ہے۔ اس کے بعد زبان سے اچھائی اور معروف کی رغبت دلانا اور برائی سے منع کرنا ہے اور تیسرا مرتبہ ہاتھ سے عملی طور پر منکرات اور فساد کو روکنا ہے۔ منکرات کے بھی واجبات اور مراتب ہیں، معمولی منکرات روزمرہ فردی زندگی میں انجام پانے والے مفاسد ہیں لیکن سب سے بڑا منکر ظلم وستم، قتل وغارت گری، دین کی تضحیک اور اصل ایمان کی ہلاکت وحرمت ہے۔ اس دنیا میں یزید سب سے بڑا منکر تھا۔ اسی وجہ سے سید الشہداء علیہ السلام نے فرمایا کہ افضل الجہاد سلطان جور کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ امام علیہ السلام نے دیکھا کہ منکرات اسلامی معاشرے میں عام ہو رہے ہیں، شرابی و کبابی حکمران برسر اقتدار ہے جو کھلم کھلا دین کا مذاق اڑاتا ہے۔ امام علیہ السلام نے ولید کے دربار میں یزید کے بارے میں فرمایا کہ

یَزِیدُ رَجُلٌ فَاسِقٌ شَارِبُ الْخَمرِ قَاتِلُ النَّفْسِ الْمُحْتَرَمَةِ
مُعْلِنٌ بِالْفِسقِ......[1]

یعنی یزید ایک فاسق وفاجر انسان ہے، شراب پیتا ہے، بے گناہ افراد کا قاتل ہے اور کھلم کھلا فسق وفجور کا مرتکب ہوتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

---

[1]......(لواعج الأشجان - السید محسن الأمین، جلد ۱، صفحہ ۲۳) (من قضایا النہضۃ الحسینیۃ) (موسوعۃ عاشوراء - الشیخ جواد محدثی، جلد ۱، صفحہ ۴۶۷) (الاستفادۃ من عاشوراء)

آپؑ نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ

وَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ إِذَا بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيْدَ......[1]

یعنی جب معاشرہ یزید جیسے حکمران میں مبتلا ہو تو پھر اسلام کی فاتحہ پڑھ دو۔ اگر ایک معمولی انسان بھی منکرات کو دیکھ کر ان سے منع نہ کرے تو بھی یہ بات قابلِ مذمت ہے چہ جائیکہ امامِ معصوم علیہ السلام اپنی آنکھوں سے ان منکرات کی ترویج ہوتی دیکھیں اور نہی عن المنکر نہ کریں؟ کیونکہ امام علیہ السلام نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

أَلَا تَرَوْنَ إِلَى الْحَقِّ لَا يُعْمَلُ بِهِ ، وَإِلَى الْبَاطِلِ لَا يُتَنَاهٰى عَنْهُ!......[2]

کیا دیکھتے نہیں کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل سے روکا نہیں جا رہا......

گویا امام اپنے قیام کی وجوہات بیان فرما رہے تھے کہ حق کی طرف امر اور باطل سے روکنے کے لیے قیام کر رہا ہوں۔ سب سے زیادہ واضح طور پر سید الشہداء علیہ السلام اپنے وصیت نامہ میں اپنے قیام کا سبب بیان کرتے ہوئے امر بالمعروف کو تنہا مقصد و ہدف قرار دیتے ہیں۔

---

[1]......(مثیر الاحزان، صفحہ ۱۰)(مقتل عوالم، صفحہ ۵۳)(مقتل خوارزمی، جلد ۱، صفحہ ۱۸۵)(لهوف۔ سید ابن طاؤوسؒ، صفحہ ۲۰)(سخنان حسین بن علی علیہما السلام، صفحہ ۱۶)

[2]......(الملهوف علی قتلی الطفوف)(حیاة الامام الحسین بن علی علیہما السلام دراسة و تحلیل)(العوالم، الامام الحسین (ع)۔ الشیخ عبداللہ البحرانی، جلد ۱، صفحہ ۲۴۵)(سخنان حسین بن علی علیہما السلام از مدینہ تا کربلا)

امام علیہ السلام نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کو اپنے دستِ مبارک سے یہ وصیت نامہ تحریر کر کے دیا کہ

وَ أَنّی لَمْ أَخْرُجْ أَشِراً، وَ لَا بَطِراً، وَ لَا مُفْسِداً، وَ لَا ظالِماً،

وَ اِنَّما خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلاحِ فِی أُمَّةِ جَدِّی، أُرِیدُ أَنْ آمُرَ

بِالْمَعرُوفِ وَ أَنْهی عَنِ الْمُنْکَرِ.....[1]

میں شرارت اور حرج و مرج کے لیے نہیں نکل رہا، میں ظالم و مفسد بن کر بھی نہیں نکل رہا بلکہ میں امتِ جد کی اصلاح کے لیے نکل رہا ہوں، میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں۔ اس خطاب میں سید الشہداء علیہ السلام نے واضح طور پر اپنے قیام کے مقصد کو امر بالمعروف قرار دیا ہے۔ شہید مرتضیٰ مطہریؒ نے واقعۂ کربلا کی تحلیل کرتے ہوئے سب سے بڑا عامل اسی عنصر کو قرار دیا ہے۔ شہید مطہریؒ کا فرمانا ہے کہ اگرچہ دیگر عوامل بھی کربلا کے واقعہ میں مؤثر ہیں لیکن ان کی تاثیر اتنی نہیں ہے جتنی عنصرِ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ہے۔ سید الشہداء علیہ السلام نے امر بالمعروف کے طور پر اپنی جان و خاندان کی قربانی دے کر ایک تو فریضۂ امر بالمعروف کی اہمیت کا احساس بیدار کیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ امر بالمعروف فقط وہاں ہی نہیں ہے جب کوئی خطرہ درپیش نہ ہو بلکہ جب تمہاری جان بھی خطرے میں ہو تو بھی امر بالمعروف واجب ہے۔ آپؑ نے خود بھی یہ فریضہ انجام دیا اور آنے والوں کے لیے بھی

---

[1]..... (عاشورا حماسہ بزرگ تاریخ) (لمعات الحسین علیہ السلام) (بحار الانوار، جلد ۴۴، صفحہ ۳۲۹) (لھوف، صفحہ ۱۱۲) (قراءات فی بیانات الثورۃ الحسینیۃ) (فضائل و سیرہ امام حسین علیہ السلام - در کلام بزرگان) (حماسہ حسینیؑ، جلد ۲، صفحہ ۲۱۹) (امام حسین (ع) از زبان شہید مطہریؒ) (بررسی تاریخ عاشورا)

یہ ثابت کر دیا کہ اگر امر بالمعروف کی راہ میں جان کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو تو بھی اسے ہر قیمت پر ادا ہونا چاہیے۔ امام علیہ السلام نے امر بالمعروف کے سطحی مفہوم کو عمق وارتقاء عطا کیا۔ روایت میں بھی آیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی معرفتِ ربوبیت، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفتِ رسالت اور اولی الامر کی معرفت امر بالمعروف کے ذریعے سے حاصل کرو یعنی اولی الامر وہی ہے جو امر بالمعروف کرے۔ امامت کے فرائض میں سے فریضۂ امر بالمعروف اہم ترین فریضہ ہے، اس کے ذریعے دینِ خدا کو قائم کیا جاسکتا ہے اور حدودِ الٰہیہ کی حفاظت کی جاسکتی ہے اور امام دین اور حدودِ الٰہی کا محافظ ہے۔

۸۔ امت کے گناہ بخشوانا

آٹھویں تفسیر یہ ہے کہ امام علیہ السلام نے یہ قیام اُمتِ جد کے گناہ بخشوانے کے لیے انجام دیا ہے، یہ عظیم قربانی اس لئے خدا کی بارگاہ میں پیش کی تا کہ گنہگاروں کو معاف کروائے۔ یہ تفسیر ان چیزوں میں سے ہے جو انسان کے دل کو بھاتی ہے۔ انسان سنتے ہی ذہن میں کہتا ہے کہ اے کاش یہی ہوتا، یہ بہت پسندیدہ تفسیر ہے اس لیے کہ سارے گنہگار اور خلاف کار بخش دیئے جائیں گے۔

کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس میں اپنے جد کی سیرت پر عمل کیا یعنی جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج پہ گئے تا کہ امت کے بوجھ کو ہلکا کر سکیں، امت کے بوجھ کو ہلکا کر کے پانچ وقت کی نماز اور ایک ماہ کے روزے لے آئے۔ کہتے ہیں فلسفۂ معراج اور فلسفۂ کربلا ایک ہی چیز ہے اور وہ امت کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو پانچ وقت نماز لے کر آئے تھے وہ بھی تھکی ہوئی امت نے نہیں پڑھی، یہ ہلکا بوجھ بھی امت نے نہیں اٹھایا، امت گنہگار ہے، عبادتیں نہیں کیں، روزے

نہیں رکھے، جن چیزوں سے روکا گیا نہیں رکے، جن چیزوں کا حکم دیا گیا اسے نہیں بجالائے، کچھ بھی نہیں کیا بلکہ گناہ کرتے رہے، مخالفتیں ہوتی رہیں۔ ایسی امت کا انجام بھی معلوم ہے کہ سارے گنہگار جہنم میں جائیں گے لیکن رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے نے جب دیکھا کہ نانا نے بوجھ ہلکا تو کر دیا لیکن یہ ہلکا بوجھ بھی امت سے نہیں اٹھایا جاسکا۔ امام حسین علیہ السلام یہ نہیں دیکھ سکتے کہ امت جہنم میں چلی جائے چنانچہ اس نرم دل امامؑ نے اس گنہگار امت کو بخشوانے کا انتظام کیا۔ جد نے امت پر بہت بڑا احسان کیا اور جو تھوڑا سا گناہ رہ گیا تھا وہ نواسے نے بخشوا دیا۔ جو بھی گناہ کرے لیکن وہ آئے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی خاطر دو آنسو بہائے تو بخش دیا جائے گا لہٰذا آپؑ نے امت کو بخشوانے کے لیے یہ قربانی پیش کی ہے۔ اب امت کی جو مرضی ہو کرتی رہے لیکن اس قربانی کے طفیل بخش دی جائے گی کیونکہ اب فدیہ ادا ہو گیا ہے۔

یہ وہی تفسیر ہے جس کا تصور مسیحیت میں بھی پایا جاتا ہے یعنی اس نظریہ کی بنیاد بنی امیہ نہیں بلکہ مسیحیت ہے، اسرائیلیت ہے۔ بہت ساری چیزیں اسلام میں اسرائیلیت کے نام سے داخل ہوئی ہیں، بہت سے یہودی جب مسلمان ہوتے تھے تو یہودی نظریات کو ساتھ لاتے تھے، یہ لوگ مسلمان ہونے سے پہلے جو عقائد اور رسوم رکھتے تھے ان کو ترک کئے بغیر مسلمان ہوئے، فقط اپنا نام مسلمان رکھا لیکن وہی یہودیت کا طرزِ تفکر، عقائد اور سنن اپنے ساتھ لائے یعنی انہوں نے یہودیت کو اسلامائز کیا، یہودیت کے عقائد کو اسلامی رنگ دے دیا۔ یہودیت اور مسیحیت کے اعتقادات جو اسلام میں داخل کئے گئے ان کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام امت کے گناہوں کا فدیہ ہیں۔ امت کے گناہ بخشوانے کے لیے سولی پر چڑھے لہٰذا اب کوئی مسیحی جہنم میں نہیں جائے گا اسی طرح یہ بھی ہے کہ

اب امت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی فرد، امام حسین علیہ السلام کی قربانی کے طفیل جہنم میں نہیں جائے گا کیونکہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو بخشوانے کے لیے یہ قربانی پیش کی ہے۔

۹۔ بنی امیہ کا قیام

نویں تفسیر یہ ہے کہ یہ قیام سرے سے امام حسین علیہ السلام کا قیام ہی نہیں تھا بلکہ یہ بنی امیہ کا قیام تھا۔ مفسروں کا خیال ہے کہ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا بلکہ بنی امیہ نے یہ جنگ شروع کی اور اسے اختتام تک بھی پہنچایا لہٰذا یہ بنی امیہ کا قیام اور جنگ تھی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اس قیام کا شکار ہوئے جیسے ایک قبیلہ کسی دوسرے قبیلے پر حملہ کرے تو اس میں سارا کردار حملہ آور قبیلے کا ہوتا ہے۔ وہ قبیلہ جس پر حملہ کیا جاتا ہے، جس کو بے دردی سے مارا پیٹا جاتا ہے اس کا جنگ میں دفاع کے علاوہ کوئی کردار نہیں ہوتا۔

دوسری مثال کہ جو ہمارے لیے بہت ہی قابلِ فہم ہے کیونکہ بعض چیزیں صرف پاکستان میں ہی سمجھ آتی ہیں باہر کی دنیا میں اگر ان کو سمجھانا چاہیں تو سمجھ میں نہیں آتیں مثلاً کسی ملک میں جا کر ڈاکے کی مثال دیں تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ ڈاکہ کیا ہوتا ہے؟ ان سے کہنا چاہیے کہ آئیں کراچی میں! آپ کو معلوم ہو جائے گا ڈاکہ کیا ہوتا ہے، مثال یہ ہے کہ اگر کسی کے ہاں ڈاکہ پڑ جائے تو کیا یہ خبر لگائی جاتی ہے کہ فلاں صاحب نے اپنے ہاں ڈاکہ پڑوا دیا؟ آج تک کسی صحافی نے ایسی رپورٹنگ (Reporting) نہیں کی، کوئی بھی ایسے نہیں لکھتا بلکہ سب کہتے ہیں کہ فلاں صاحب کے گھر میں ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈالا، یعنی یہ کام ڈاکوؤں کا ہے۔ صاحبِ خانہ کا اس میں کوئی کردار نہیں ہوتا، یہ

بے چارے بے بس ہوکر دیوار کے ساتھ ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی مزاحمت کرنے کی کوشش کرے تو اسے مار ڈالتے ہیں، یہ حقیقت میں ڈاکوؤں کا فعل اور قیام ہوتا ہے۔ جن پر ڈاکہ ڈالا گیا وہ اس میں دماغی سوچ بچار کے علاوہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے ہیں۔

اسی طرح یہ تفسیر کرنے والے کہتے ہیں کہ بنی امیہ نے ڈاکوؤں کی طرح ڈاکہ ڈالا، اچھا کیا یا غلط کیا وہ الگ بات ہے لیکن انہوں نے ڈاکوؤں کی طرح ڈاکہ ڈالا کہ بعض کو اسیر کیا، بعض کو مار دیا پھر ڈاکوؤں کی طرح سب کچھ لوٹ لیا لہٰذا یہ تو بنی امیہ کا کام ہے، اس میں آپ بار بار کیوں کہتے ہیں کہ یہ قیامِ امام حسین علیہ السلام ہے، امام حسین علیہ السلام نے سرے سے قیام ہی نہیں کیا بلکہ ان کے گھر میں ڈاکہ پڑا، ڈاکوؤں نے آکر لوٹ لیا، آپ اگر قیام کہنا بھی چاہتے ہیں تو کہیں کہ بنی امیہ کا قیام، بنی امیہ کی جنگ، اگر کہنا چاہتے ہیں کہ یہ کربلا کا واقعہ کیوں پیش آیا تو یہ نہ کہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے یہ کام کیوں کیا؟ بلکہ کہیں کہ بنی امیہ نے یہ کام کیوں کیا؟ یہ بحث کرنی چاہیے کہ آخر بنی امیہ نے اتنی جرأت کیوں کی؟ یہ تفسیر کرنے والوں نے واقعۂ کربلا کا رُخ ہی بدل دیا، اس سے پہلے ہم سوچتے تھے کہ امام حسینؑ نے یہ جو قیام فرمایا اس کا مقصد کیا تھا؟ لیکن یہ مفسر کہتے ہیں کہ بنی امیہ نے یہ جو قیام کیا ان کے مقاصد کیا تھے؟ پھر آکر انہوں نے بیان بھی کیا کہ بنی امیہ کے یہ مقاصد تھے، البتہ یہ نکتہ بیان کرنا ضروری ہے کہ یہ ساری باتیں ضروری نہیں ہیں کہ مسلمانوں نے کی ہوں بلکہ غیر مسلموں نے بھی اپنے نظریات اور تفاسیر پیش کی ہیں۔ یہی وہ رکاوٹیں ہیں جنہیں عبور کرنا ضروری ہے تاکہ ہم صحیح تفسیر تک پہنچ سکیں۔

۱۰۔ خلافت کو بچانا

دسویں تفسیر یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے جب دیکھا کہ خلافت جو کہ اسلامی طرزِ حکومت ہے، اسلام کا ایک سسٹم ہے وہ اپنے خط سے ہٹ رہا ہے، خلافت کو ملوکیت میں بدلا جا رہا ہے، مکمل طور پر سسٹم تبدیل ہو رہا ہے تو امام حسین علیہ السلام اس پر راضی نہیں تھے، اگرچہ خود بھی اقتدار میں آنا نہیں چاہتے تھے لیکن اسلامی طرزِ حکومت یعنی خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو یہ بھی نہیں چاہتے تھے۔ درحالیکہ بنی امیہ یہی چاہتے تھے کہ خلافت ملوکیت میں بدل جائے، وہ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے درپے تھے، خلیفہ سوم کے زمانے تک خلافت کا نظام قائم رہا لیکن خلیفہ سوم کے زمانے سے ہی اس نظام میں انحراف آنا شروع ہوا، خلیفہ سوم نے اپنی منشاء کے تحت آہستہ آہستہ اس میں ردو بدل کی کہ جس کی وجہ سے خلافت بتدریج ملوکیت کی طرف جانے لگی۔

خلافت اور ملوکیت دو طرزِ حکومت ہیں، دو سسٹم ہیں، جس طرح سے ہمارے ملک میں کسی زمانے میں پارلیمانی حکومت تھی پھر بعد میں ایک صاحب آئے اور انہوں نے اس کو صدارتی نظام میں بدل دیا۔ پھر دوسرے آئے انہوں نے پارلیمانی سسٹم بنایا، شاید بعد میں آنے والے سوچیں کہ اس کو صدارتی نظام میں بدل دیں اور اس طرح بھی نہیں ہوتا کہ صرف ایک طرزِ حکومت بدلتا ہے بلکہ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ بنی امیہ خلافت کو ملوکیت میں کیوں تبدیل کرنا چاہتے تھے؟ اس لیے کہ خلافت ایک ایسا طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بہت سے چہرے سامنے آسکتے ہیں۔ اس میں کوئی حد نہیں ہے، اس میں کوئی قید و بند نہیں ہے بلکہ امت کسی بھی اصل فرد کو اٹھا کر خلیفہ بنا سکتی ہے لیکن ملوکیت میں ہر ایک نہیں آسکتا، ملوکیت میں وراثت چلتی ہے، بادشاہ کا بیٹا بادشاہ بنتا ہے۔ ملوکیت طرزِ حکومت کے نمونے سعودی

عرب اور دوسری عرب ریاستوں میں موجود ہیں۔

مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کا تصور یہ ہے کہ اسلام کا حکومت سے کیا رابطہ ہے، اسلام تو عبادتیں کروانے کے لیے آیا ہے، اسلام فقط صوم وصلوٰۃ، ذکر و تسبیح اور مساجد تک محدود ہے، حکومت اور سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن بعض کا نظریہ ہے کہ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں نظامِ حکومت بھی ہے۔ اہل سنت کی اکثریت کے نزدیک اسلامی نظامِ حکومت وہی خلافت ہے جس کا نمونہ خلافت راشدہ ہے لیکن امامیہ کے نزدیک اسلامی طرزِ حکومت خلافت نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اسلامی نظامِ حکومت امامت وولایت ہے۔

خلافت اور امامت یا ولایت دو الگ الگ نظامِ حکومت ہیں اور بنیادی نزاع یہ نہیں ہے کہ خلیفہ اول کون ہیں، آیا وہ خلیفہ ہیں جنہیں اہل سنت خلیفہ کہتے ہیں یا وہ کہ جن کے ہم امامیہ قائل ہیں، فرد کی بحث نہیں ہے، اگر کوئی فردی نزاع ہوتا تو یہ اسی وقت ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ آخر کار انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ کے طور پر مان لیا لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں طرزِ حکومت ہی ولایت و امامت ہے، حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ کے بعد ولی امت اور ولی امر ہیں، جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری جانوں پر ہم سے زیادہ ولایت اور حقِ تصرف رکھتے ہیں اسی طرح حضرت علی علیہ السلام بھی وہی ولایت رکھتے ہیں۔ بہر کیف اسلامی طرزِ حکومت خلافت ہو یا ولایت لیکن بنی امیہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ یہ طرز حکومت تبدیل کرنا ہے اور اسے ملوکیت میں بدل کر ہمیشہ کے لیے قابض رہنا چاہتے تھے، ابوسفیان کے بیٹے معاویہ نے اپنے بیس سالہ دورِ حکومت میں اس کی جڑیں مستحکم کر دیں اور آخر کار اپنے بعد کے لیے یزید کی جانشینی کا اعلان کر کے خلافت کو مکمل طور پر ملوکیت میں تبدیل کر ڈالا۔

خلافت کو بچانا

حضرت امام حسین علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اسلامی طرزِ حکومت انحراف کا شکار ہوگئی ہے اور خلافت ملوکیت میں بدل گئی ہے تو آپ نے اٹھ کر اسے دوبارہ اپنی ڈگر پر لانے کی کوشش کی، آپ کی یہ عظیم قربانی خلافت کو بچانے کے لیے تھی، علامہ اقبالؒ کے اشعار میں بھی اس تفسیر کی طرف اشارہ ملتا ہے، علامہ فرماتے ہیں:

چون خلافت رشتہ از قرآن گسیخت

حریت را زہر اندر کام ریخت.....[1]

جب خلافت نے اپنا رشتہ قرآن سے منقطع کر دیا یعنی خلافت انحراف کا شکار ہو کر ملوکیت کی طرف جانے لگی تو اس کے نتیجے میں حریتِ اسلامیہ کی موت واقع ہوگئی۔

خلافت کو بچانا

خاست آن سر جلوہ ی خیر الامم

چون سحاب قبلہ باران در قدم

برزمین کربلا بارید و رفت

لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

اس وقت وہ سر جلوہ خیر الامم مانند ابر کرم اٹھے اور کربلا میں اپنے خون سے لالہ وگل کھلا گئے۔

تا قیامت قطع استبداد کرد

موج خون او چمن ایجاد کرد

---

[1]..... کلیات اقبالؒ، فارسی، رموزِ بیخودی، در معنی حریت اسلامیہ وسر حادثۂ کربلا

امام حسین علیہ السلام نے استبداد وملوکیت کے اصولوں کو ہمیشہ کے لیے جڑ سے اکھاڑ دیا اور آپ کے لہو سے گلشنِ اسلام کی سیرابی ہوئی۔ ان اشعار میں علامہ اقبالؒ صاف فرماتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے ملوکیت کے خاتمہ کے لیے یہ قربانی پیش کی ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ خلافت باقی رہے۔ البتہ خود اقتدار میں آنا بھی نہیں چاہتے تھے یعنی سلطنت پر قبضہ کرنا آپ کا مقصد نہیں تھا، آپ کا مقصد صرف خلافت کو بچانا تھا،

پھر فرماتے ہیں کہ

بہر حق در خاک و خون غلتیدہ است
پس بنای لا الٰہ گردیدہ است
مدعایش سلطنت بودی اگر
خود نکردی با چنین سامان سفر
دشمنان چون ریگ صحرا لا تعد
دوستان او بہ یزدان ہم عدد
سرّ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود
یعنی آن اجمال را تفصیل بود

یعنی آپ حق کی خاطر خاک وخون میں غلطاں ہوکر لا الہ الا اللّٰہ کی بنیاد بن گئے، اگر آپ کا مقصد و مدعا سلطنت وحکومت حاصل کرنا ہوتا تو اس طرح بغیر تیاری کے، بے سروسامان اور چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت ہرگز سفر نہ کرتے کیونکہ حکومت پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے ایک بہت بڑے لشکر

کی ضرورت ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ آپ کے دشمن بھی صحرائی ذروں کی طرح بے شمار تھے اور دوست یزدان کے حروفِ ابجد ۷۲ کے برابر تھے۔ آگے فرماتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کی تفصیل ہے اس لیے آپ علیہ السلام خود ہی باطن میں ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کے پوشیدہ راز ہیں۔

علامہؒ اسی کلام میں کیا عجب فرماتے ہیں کہ

اللّٰہ اللّٰہ بای بسم اللّٰہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

۱۱۔ شیعہ کشی کی روک تھام

گیارہویں تفسیر یہ ہے کہ بنی امیہ کے دور میں بالخصوص یزید کے باپ ابن ابی سفیان اور خود یزید کے دورِ حکومت میں شیعہ کشی کا عمل اپنے عروج پر جا پہنچا تھا، بے لگام قسم کی قتل و غارت شروع ہوگئی تھی یعنی وہی زمانہ جو آج کل ہمارے ملک میں ہے کہ شیعہ کو مارنا ایک عبادت سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ خود کربلا میں بھی ظالمین و قاتلین نے قربۃً الی اللہ یہ قتل و غارت اور ظلم و ستم کیا۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام جب مدینہ میں واپس پلٹے تو قبر اطہر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضر ہو کر فرمایا کہ اے میرے جد بزرگوار! یہ لوگ جب تیرے نواسے کو قتل کر رہے تھے تو اس قتل کے ذریعے سے تقربِ خدا مانگ رہے تھے۔ تیرے نواسے کو قربۃً الی اللہ قتل کر رہے تھے، وہ لوگ اس کام کو عبادت سمجھ رہے تھے لہٰذا شیعہ کشی کا سلسلہ جاری تھا، حضرت امام حسین علیہ السلام نے دیکھا کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا اور یہ ایک ایک کر کے

سب کو ٹھکانے لگاتے رہے تو شیعت ختم ہو جائے گی، کوئی بھی شیعہ زندہ نہیں رہے گا لہٰذا اس قتلِ عام اور غارت گری کو روکنے کی ضرورت ہے، آپؑ نے یہ اقدام شیعہ کشی کو روکنے کے لیے اٹھایا..... ا۔ اس طرح آپؑ نے اپنے مبارک خون کے ذریعے تشیع کو تحفظ دلایا۔

◄◄ حُجر اور اس کے ساتھیوں کا مظلومانہ قتل

حجر بن عدی بن حرث بن عمرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے، زہد و تقویٰ اور پارسائی میں مشہور تھے، بڑے عبادت گزار اور مستجاب الدعوات تھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے تھے، جب بھی تجدیدِ وضو کرتے بلا فاصلہ دو رکعت نماز پڑھتے تھے، آپ دن رات میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ شام اور قادسیہ کی فتوحات میں لشکر اسلام کے برجستہ سپاہی تھے۔ جنگِ جمل میں امیر المومنین علیہ السلام کے ہم رکاب جبکہ جنگِ صفین اور جنگِ نہروان میں امیر المومنین علیہ السلام کے لشکر کے جنگی کمانڈرز میں سے تھے۔ آپ سب سے پہلے مسلمان ہیں جو ہاتھ پاؤں باندھے ہوئے بے دفاع امیر شام کی جیل میں چھ ساتھیوں سمیت شہید کر دیئے گئے۔ جب مغیرہ بن شعبہ کے بعد زیاد ابن ابیہ کوفہ کا حکمران تھا تو برسر منبر حضرت علی علیہ السلام کو لعن طعن کرتا تھا۔

آپ اس غلیظ زبان کے جواب میں فرماتے تھے کہ:

ا..... شیعہ کُشی وہ حرکت تھی جو معاویہ کے زمانہ سے شروع ہو کر آج تک جاری ہے۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف ایک نمونہ ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کا مظلومانہ قتل ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ تم جس شخص کی مذمت کرتے ہو وہ لائقِ تمجید و تحسین ہے اور جس کی تم تعریفیں کرتے ہو وہ مذمت کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

آپ ہمیشہ ان کے جواب میں بلند آواز سے یہی جملہ دہراتے تھے تو مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے دو تہائی سے زیادہ لوگ بلند آواز سے کہہ دیتے تھے کہ خدا کی قسم حجر سچ کہتا ہے اور بہت اچھا کہتا ہے۔ زیاد بن ابیہ نے حجر اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کا حکم دیا لہٰذا حجر کو گرفتار کر کے دس دن کوفہ کے جیل خانہ میں رکھا گیا، اس مدت میں آپ کے باقی ساتھیوں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ پھر رات کی تاریکی میں ان دلیروں کو شہر سے نکال کر دمشق کی طرف روانہ کیا گیا، کہتے ہیں کہ جب یہ لوگ کوفہ سے باہر جا رہے تھے تو حجر کے ساتھیوں میں سے قبیصہ بن ربیعہ کا گھر راستے میں تھا، اس نے دیکھا کہ اس کی بیٹیاں کھڑکیوں کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ رقت آمیز منظر دیکھ رہی ہیں، اپنے باپ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ کر رو رہی ہیں لہٰذا قبیصہ نے آگے بڑھ کر اپنی بیٹیوں سے کچھ باتیں کیں، ان کو نصیحت کر کے پھر چل پڑے۔ دمشق سے بارہ میل کے فاصلہ پر ''عذرا'' کے مقام پر ان کو جیل میں بند کر دیا گیا۔ چند دنوں بعد امیر شام کی طرف سے جلاّد کفن لے کر آئے، معاویہ کے مامور جلاّد کارندوں نے حجر کو مخاطب کر کے کہا:

اے کفر و نفاق کے مرکز اے گمراہی پھیلانے والے، اے علی سے محبت رکھنے والے، ہمارے امیر نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کے قتل کا حکم دیا، مگر یہ کہ تم کفر سے باز آجاؤ اور اپنے محبوب علی کو لعن طعن کر کے اس

سے بیزاری کا اعلان کرو۔

حجر اور ان کے ساتھیوں نے کہا:

> سر قلم ہونا حضرت علی علیہ السلام سے بیزاری سے کہیں زیادہ ہمارے لیے آسان ہے، تیز تلواروں کا مزہ چکھنا، اللہ، رسولؐ اور وصیِ رسولؐ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر جہنم کی آگ میں جلنے سے ہمارے لیے زیادہ پسندیدہ ہے۔

لہٰذا قبریں کھودی گئیں، پوری رات یہ مردانِ خدا اللہ سے راز و نیاز اور عبادت میں مشغول رہے، جب صبح ہوئی اور ان کو قتل کے لیے آمادہ کیا گیا تو حجر نے ان سے کہا:

> ذرا مجھے مہلت دیجیے تاکہ میں وضو کر کے آخری دو رکعت نماز پڑھ لوں، میں نے کبھی بھی ایسا وضو نہیں کیا کہ جس کے بعد دو رکعت نماز نہ پڑھی ہو۔

بالآخر حجر نے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ خدا کی قسم زندگی میں کبھی بھی اس طرح عجلت سے نماز نہیں پڑھی، یہ بھی اس لیے کہ تمہیں یہ خیال نہ ہو کہ ڈر کے مارے لمبی نمازیں پڑھتا ہے، اگر تمہارا یہ خیال نہ ہوتا تو میں ذرا طولانی نماز پڑھتا۔ پھر ھدبۃ بن فیاض قضاعی تلوار کھینچ کر ان کی طرف بڑھا تو حجر لرزنے لگے، انہوں نے کہا کہ

> تو نے بے تابی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو اپنے صاحب سے بیزاری کا اعلان کرو۔

حجر نے کہا:

بے تاب کیوں نہ ہوں جبکہ برہنہ شمشیر، تیار کفن اور کھدی ہوئی قبریں
دیکھ رہا ہوں! لیکن خدا کی قسم! ایسی بات کبھی بھی نہیں کروں گا جو باعثِ
قہر خدا ہو۔

حجر بن عدی، صحابیٔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری جملہ یہ تھا:

میری ہتھکڑیاں اور طوق گردن نہ کھولنا، میرے بدن سے میرے خون
کو صاف نہ کیا جائے کیونکہ کل معاویہ سے ملنا ہے اور اس کی شکایت
کرنی ہے۔

حجر بن عدی کندی کے باقی چھ ساتھی جو ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے بے دردی سے قتل ہوئے یہ ہیں:

۱۔ شریک بن شہداد حضرمی
۲۔ صیفی بن فَسیل شیبانی
۳۔ عبدالرحمٰن بن حسان عنزی
۴۔ قَبیصہ بن ضُبیعۃ عَبسی
۵۔ کدام بن حیان عنزی
۶۔ مُحرز بن شہاب بن بجیر بن سفیان بن خالد بن منقرا التمیمی۔

مرحوم طبرسیؒ نے احتجاج میں بیان فرمایا ہے:

عن صالح بن کیسان قال: لما قتل معاویة حجر بن عدی

وأصحابه، حج معاوية ذلک العام، فلقى الحسين بن على (عليهما السلام) فقال معاوية: يا أبا عبد اللّٰه ! هل بلغک ما صنعنا بحجر وأصحابه وأشياعه وشيعة أبيک؟ فقال: ما صنعتم بهم؟ قال: قتلناهم و كفناهم وصلينا عليهم، فقال الامام الحسين (عليه السلام): خصمک القوم يا معاوية ولكنا لو قتلنا شيعتک ما كفناهم، ولا صلينا عليهم ولا قبرناهم،..... [1]

صالح بن کیسان کہتا ہے کہ جب معاویہ نے ''حجر اور ساتھیوں'' کو قتل کیا تو اسی سال حج پر گیا، اسی دوران حضرت امام حسین علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، معاویہ نے کہا، اے ابا عبداللہ کیا نہیں سنا کہ ہم نے حجر اور ساتھیوں اور تیرے باپ کے شیعوں کے ساتھ کیا کیا؟ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: تُو نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے؟ کہا: ہم نے ان کو قتل کیا، کفن پہنا کر ان کے جنازوں پر نماز پڑھی۔ امام حسین علیہ السلام نے تبسم کیا پھر فرمایا: وہ تجھ پر غالب آئے ہیں، لیکن اگر ہم تیرے شیعوں کو قتل کریں تو ان کے

---

[1]..... (الاحتجاج طبرسی، جلد۲، صفحہ۲۹۷-۲۹۶) (سلسلة الأعلام من الصحابة والتابعين) (ذخيرة الدارين، موضوع: اصحاب الامام الحسينؑ، تألیف: عبدالمجید بن محمد رضا الحسینی الحائری شیرازی)

جنازوں پر نماز نہیں پڑھیں گے اور نہ ہی ان کا کفن دفن کریں گے،......

اسی طرح حضرت امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے نام اپنے مکتوب میں بھی حجر اور ان کے ساتھیوں کا تذکرہ کیا ہے:

الست قاتل حجر بن عدی و اصحابه العابدين المخبتين الذين كانوا يستفظعون البدع و يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر فقتلتهم ظلما و عدوانا بعد ما اعطيتهم المواثيق الغليظه و العهود الموكده جراه على الله و استخفافا بعهده......[1]

کیا تو نے حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو قتل نہیں کیا کہ جو نیک سیرت، اللہ کے مطیع اور عبادت گزار بندے تھے اور بدعات کو بُرا سمجھتے تھے، امر بالمعروف و نہی از منکر کرتے تھے، تو نے ان کو سخت قسموں اور محکم عہد و پیمان کہ جو تیرے اور ان کے درمیان باندھے گئے تھے کے بعد نہایت ظلم اور بے دردی سے قتل کیا۔ تو نے اللہ پر جرأت کی اور اس کے عہد کو خفیف جانا۔

حجر اور اس کے ساتھیوں کا مظلومانہ قتل

اسی طرح اور بہت سارے نمونے ہیں کہ جہاں رؤسائے شیعہ نہایت بے دردی سے قتل کئے گئے، ان میں بعض اصحاب رسول اللہ بھی تھے، ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ امیر المومنینؑ سے محبت رکھتے

[1]...... بررسی تاریخ عاشورا

تھے مثلاً عمرو بن الحمق خزاعی، رشید ہجری، جُویریۃ بن مسہر عبدی جیسی عظیم ہستیاں ان دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہوئیں۔ عمرو بن الحمق خزاعی کے قتل کے متعلق امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کو لکھا:

او لست قاتل عمرو بن الحمق الذی، اخلقت و البت وجهه العباده فقتلته من بعد ما اعطیته من العهود ما لو فهمته العصم نزلت من سقف الجبال ؟.....[1]

کیا تم عمرو بن حمق خزاعی صحابی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاتل نہیں ہو؟ حالانکہ عمرو بن حمق خزاعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ عظیم الشان صحابی تھے کہ اللہ کی عبادت کر کے ان کا جسم نحیف و لاغر اور رنگ زرد ہو چکا تھا، پہلے تو نے ان کو امان دی اور ایسا عہد و میثاق باندھنے کے بعد کہ اگر تو کسی پرندے کو ایسا عہد دیتا تو وہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے اتر کر تیرے پاس آجاتا، پھر بھی تو نے عہد کا پاس نہ رکھتے ہوئے ان کو قتل کیا..... [2]

۱۲۔ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار کو بچانا

بارہویں تفسیر یہ ہے کہ معاویہ ابن ابی سفیان کے دور میں ایک بہت ہی پلید حرکت کا آغاز

---

[1]..... بررسی تاریخ عاشورا [2]..... مزید تفصیل کے لیے کتاب ''صلح امام حسنؑ''، تالیف شیخ راضی آل یاسین، ترجمہ سید علی خامنہ ای، انتشارات آسیا، چاپ سیزدھم، ۱۳۷۸ھ)

ہوا کہ انہوں نے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار مٹانا شروع کر دیئے، آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جتنی احادیث تھیں ان کو ختم کروایا، پابندی لگا کر ان کو ممنوع قرار دیا گیا، یہ لوگ چاہتے تھے کہ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام تک نہ رہے، اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ تعلق رکھنے پر سزائیں دینا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ خطبوں کے اندر، منبروں کے اوپر خصوصاً امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں معاذ اللہ لعن طعن شروع کروائی اور یہ سلسلہ بنی امیہ کی حکومت میں چلتا رہا، عمر بن عبدالعزیز کے زمانے تک قانونی شکل میں ہر خطیب کو یہ کام کرنا پڑتا تھا ورنہ ایسا شخص جمعہ نہیں پڑھا سکتا تھا اور نہ ہی نماز کی امامت کر سکتا تھا۔ آخر کار عمر بن عبدالعزیز نے رسمی طور پر یہ بدعت ختم کروائی۔..... [1]

بہر کیف حضرت امام حسین علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بنی امیہ اس طرح سے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار مٹانے کے درپے ہیں اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام تک ختم کر دیں گے لہٰذا آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام اور آثار بچانے کے لیے آپ نے یہ عظیم قربانی دی۔..... [2]

---

[1]..... تمام صوبوں کو لکھ کر بھیجا کہ ائمہ جمعہ و جماعت یہ کام نہ کریں۔

[2]..... مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ نہج البلاغہ خطبہ ۵۷ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ معاویہ کا امیر المومنین علیہ السلام پر سب و شتم کرنا اور اپنے عاملوں کو اس کا حکم دینا تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں اور منبر پر ایسے الفاظ کہے جاتے تھے کہ جن کی زد میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آجاتے تھے۔ چنانچہ ام المومنین ام سلمہ علیہا السلام نے معاویہ کو لکھا: انکم تلعنون اللّٰہ و رسولہ علی منابرکم ذالک انکم تلعنون علی بن ابی طالب و من احبہ و انا اشھد ان اللّٰہ احبہ و رسولہ. (عقد الفرید، جلد ۳، صفحہ ۱۳۱)

”تم اپنے منبروں پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لعنت کرتے ہو وہ یوں کہ تم علیؑ ابن ابی طالبؑ اور انہیں ⇦

۱۳۔ بدعتوں کو مٹانا

تیرہویں تفسیر یا فلسفہ جو اس قیام کے لیے بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے یہ قیام بدعتوں اور خرافات کے خلاف کیا تھا، اس دور میں بدعتیں اور خرافات اپنے عروج پر جا پہنچیں تھیں۔ دین کے اندر نئی نئی بدعتیں پیدا کرنا، من گھڑت رسومات کو رائج کرنا اس دور میں عام ہو گیا تھا۔[1]

بدعت گزاری ایک مسلسل عمل ہے جو رُکتا نہیں، دین کے آغاز سے ہی یہ عمل شروع ہو گیا تھا جو آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا، لہٰذا صاحبِ دین، صاحبِ شریعت نے پہلے دن ہی اس بات کی طرف توجہ دلا دی کہ دین کے نام پر، دین کے اندر انسانی افکار اور خود ساختہ نظریات جزوِ دین بنا کر داخل

⇦ دوست رکھنے والوں پر لعنت کرتے ہو اور میں گواہی دیتی ہوں کہ علیؑ کو اللہ بھی دوست رکھتا تھا اور اس کا رسولؐ بھی"۔

ابن ابی الحدید لکھتے ہیں کہ ابوعثمان نے روایت کی ہے: **أن قوما من بنی أمیة قالوا لمعاویة یا أمیر المؤمنین انک قد بلغت ما أملت فلو کففت عن لعن هذا الرجل فقال لا واللہ حتی یربو علیه الصغیر ویهرم علیه الکبیر ولا یذکر له ذاکر فضلا** (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید)

بنی امیہ میں سے ایک گروہ نے معاویہ سے کہا: امیر المومنین تو جو چاہتا تھا وہ پا لیا، اب تو اس آدمی (امیر المومنین علی علیہ السلام) کے لعن طعن سے باز آ جا۔ معاویہ نے کہا: ہرگز نہیں، خدا کی قسم یہاں تک کہ اس کام کو کرتے ہوئے چھوٹے بڑے اور بڑے بوڑھے ہو جائیں تا کہ کوئی بھی اس کی کسی فضیلت کا تذکرہ نہ کرے۔

[1]..... یہاں تک کہ معاویہ نے نمازِ جمعہ بدھ کے دن پڑھائی اور لوگوں نے اعتراض تک نہیں کیا۔

(کتاب صلح امام حسن علیہ السلام، مترجم سید علی خامنہ ای مدظلہ، صفحہ ۳۱۴)

کیے جائیں گے جو بدعت کہلائیں گے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ ایک رواج بن گیا تھا۔ بعض بدعتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد شروع ہوئیں تھیں آج تک موجود ہیں۔ حالانکہ سب معترف ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہ چیزیں نہیں تھیں یعنی دین کا حصہ نہیں تھیں، خداوند تعالیٰ نے انہیں بیان نہیں کیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ دوسروں نے خیر خواہی یا کسی بھی محرّک کے تحت یہ کام کیا تھا، یہ بھی ہے کہ ہر بدعت گزار کی نیت خراب نہیں ہوتی، بعض کی نیت بہت اچھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اذان کے اندر بدعت ڈالی گئی، اس بات کے سب معترف ہیں اور اہل سنت مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بعض جملے اذان میں موجود تھے لیکن انہیں نکال دیا گیا، جیسے حی علی خیر العمل کو نکال کر اس کی جگہ الصلوٰۃ خیر من النوم کو رائج کیا گیا۔

اس کام کو انہوں نے بدعتِ حسنہ کا نام دیا کہ یہ اچھی بدعت ہے اور اس کا فائدہ بہت زیادہ ہے لہٰذا اس کا رواج ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ دوم کا زمانہ فتوحات کا زمانہ تھا، جتنی فتوحات خلیفہ دوم کے زمانے میں ہوئی ہیں اتنی اور زمانوں میں نہیں ہوئیں لہٰذا ضرورت تھی کہ لوگوں کے اندر جہادی روح اور جنگی جوش و ولولہ پیدا کیا جائے۔ اس فکر کے حامل لوگوں کے مطابق لوگ زیادہ ثواب کے چکر میں

---

[1] ..... امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: وَمَا أُحدِثَتْ بِدْعَةٌ الَّا تُرِکَ بِهَا سُنَّةٌ. فَاتَّقُوا الْبِدَعَ، والْزَمُوا الْمَهْيَعَ، انَّ عَوَازِمَ الْأُمُورِ أَفْضَلُهَا، وَانَّ مُحْدِثَاتِهَا شِرَارُهَا. (خطبہ ۱۴۳) ''کوئی بدعت وجود میں نہیں آتی مگر یہ کہ اس کی وجہ سے سنت کو چھوڑنا پڑتا ہے، بدعتی لوگوں سے بچو، روشن طریقہ پر جمے رہو، پرانی باتیں ہی اچھی ہیں اور (دین میں) پیدا کی ہوئی نئی چیزیں بدترین ہیں''۔

ہوتے ہیں کہ جدھر زیادہ ثواب ملے ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔اب اگر انہیں کہا جائے کہ آپ آئیں جنگ لڑیں تو وہ کہتے تھے کہ حی علٰی خیر العمل تو نماز ہے لہٰذا زیادہ ثواب نماز میں ہے اور نماز تو ہم کسی جگہ بھی پڑھ سکتے ہیں، چھپ کے اور تقیہ کی حالت میں بھی پڑھ سکتے ہیں، اپنے گھر میں آسودگی سے زیادہ خضوع وخشوع کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔اگر بہترین عمل نماز ہے تو بہترین عمل کو چھوڑ کر ہم جہاد کے لیے کیوں چلے جائیں؟ گھر کے بہترین ماحول، سکون اور امن و امان کو چھوڑ کر ہم بارڈر (Border) پر چلے جائیں اور جنگ لڑنا شروع کر دیں، جنگ کی حالت میں تو آسودگی سے نماز بھی نہیں پڑھی جا سکتی ہے، وہاں خطرہ ہوتا ہے، کہیں سے بھی کوئی تیر آ سکتا ہے، بھوک اور پیاس لگ سکتی ہے، پھر اس میں زیادہ ثواب بھی نہیں اس لیے کہ جہاد تو بہترین عمل نہیں بلکہ بہترین عمل نماز ہے اور بہترین عمل کا ثواب بھی زیادہ ہے۔

انہوں نے سوچا کہ جہادی زمانے اور ماحول کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو جہاد کی طرف رغبت دلائی جائے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب بہترین عمل جہاد کو قرار دیا جائے نہ کہ نماز کو لہٰذا اذان میں حی علٰی خیر العمل نہیں کہنا چاہیے چونکہ اس سے ذہن میں آتا ہے کہ جہاد کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ سارا خیر، ساری برکت اور ثواب نماز میں ہے، ان حالات میں مومنین نماز کو اہمیت دیں گے اور جہاد کی طرف نہیں جائیں گے لہٰذا اسے بدل دیا، اس طرح خیر العمل جہادی نعرہ بن گیا، نماز کے بارے میں کہا گیا کہ یہ بھی ٹھیک ہے، بہت اچھی چیز ہے لیکن سب سے اچھی چیز نہیں ہے بلکہ نیند سے بہتر ہے۔ صبح وشام سوئے رہتے ہو اس سے بہتر ہے کہ اٹھ کر نماز پڑھو لیکن یہ نہ کہو کہ نماز بہترین عمل ہے تاکہ لوگوں کے اندر جہاد کی روح کم نہ پڑ جائے یا ختم نہ ہو جائے۔

دیکھیں یہ کتنا مخلصانہ اور ہمدردانہ نظریہ ہے، ظاہر ہے جہاد ہوگا تو دین پھیلے گا، نماز بھی پھیلے گی، خیر العمل جہاد کو ہونا چاہیے، نہایت ہی نیک نیتی سے یہ کام کیا گیا ہے لیکن بدعت بہر حال بدعت ہے، اچھا محرک ہو یا برا، کسی چیز کو جو دین کا حصہ نہیں ہے آپ اسے دین کا جزو نہیں بنا سکتے، کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی من پسند چیزیں دین میں داخل کرے یا نکالے، یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کہ کسی چیز کو دین کے اندر قرار دے یا کسی چیز کو دین سے باہر نکال دے۔ ہم صبح کی دو رکعت نماز پڑھتے ہیں، ہمارے پاس وقت بھی ہے، حال و حوصلہ بھی ہے اور ہم کہیں کہ اب چار رکعت پڑھ لیتے ہیں حالانکہ دو رکعت کی بجائے چار رکعت نماز پڑھنا یقیناً باطل ہے بلکہ بدعت ہے اس لیے کہ جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے وہی پڑھنا ہے، نہ کم نہ زیادہ، ورنہ اگر میں اپنی پسند کا دین بنانا شروع کر دوں، دوسرا اپنی پسند کا دین بنانا شروع کر دے تو دینِ خدا ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا دین میں بدعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ روشن فکر لوگ زیادہ چاہتے ہیں کہ ایسی چیزیں جو آج ماڈرن (Modern) دور کی ہیں انہیں بھی دین میں شامل کر دیں، یہ روشن فکری قدیم زمانے سے رائج تھی اور آج تک جاری ہے۔ اگر علماء اور دین کا درد رکھنے والے ذمہ دار لوگ اس کا راستہ نہ روکیں، بدعتوں کے راستے کی رکاوٹ نہ بنیں تو دین مسخ ہو جائے گا لہٰذا اس تفسیر کے قائلین کا نظریہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے جب دیکھا کہ عجیب و غریب بدعتیں دین کے اندر داخل کی جاری ہیں اور کوئی روکنے والا بھی نہیں ہے تو انہیں روکنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ آپ نے بدعت گزاروں کے خلاف قیام کیا، نبرد آزما ہوئے اور جنگ کی اور لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ہم دین میں بدعت داخل نہیں ہونے دیں گے۔

بدعتوں کو مٹانا

۱۴۔ وظیفہ شرعیہ پر عمل پیرا ہونا

چودھویں تفسیر جو اس قیامِ مقدس کے لیے بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آپؑ نے اپنے وظیفۂ شرعیہ پر عمل کیا، آپؑ کا شرعًا یہی وظیفہ بنتا تھا۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کے جو وظائف اور فرائض مقرر کئے ہوئے ہیں وہ مختلف حالات کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں، انسان اپنی طرف سے کوئی کام نہ کرے بلکہ یہ دیکھے کہ اس وقت میرا وظیفہ کیا بنتا ہے؟ ممکن ہے کسی زمانے میں خاموش رہنا، گوشہ نشین ہونا کسی کا وظیفۂ شرعیہ ہو، کسی زمانے میں جنگ کرنا، قیام کرنا، تلوار اٹھانا وظیفۂ شرعیہ ہو اور ممکن ہے کسی زمانے میں قتل ہونا، خدا کی راہ میں شہید ہونا کسی کا وظیفۂ شرعیہ ہو، جو لوگ شرعی وظائف کا خیال نہ رکھیں ان کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یہ کام کیوں کیا یا کیوں نہیں کیا؟ ایک عام آدمی جو شریعت کا اتنا پابند نہیں ہے اگر ایک کام انجام دے تو اس کے بارے میں ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ کیوں کیا؟ لیکن وہ انسان جس کا اپنا کوئی موقف نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ شارعِ مقدس نے کیا کہا ہے، خداوند تعالیٰ کا حکم کیا ہے، جو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہی انجام دیتا ہے۔ اسی کو تعبد اور عبودیتِ محض کہتے ہیں یعنی انسان اپنی کوئی رائے نہ رکھتا ہو بلکہ اپنے مولائے حقیقی کا تابعِ محض ہو۔

مثلاً آج کل بعض لوگوں نے اپنے گھروں میں ملازمین رکھے ہوئے ہیں یا ڈرائیور رکھا ہوا ہے تو مالک اپنے ڈرائیور سے کہتا ہے کہ گاڑی اسٹارٹ کرو، وہ گاڑی اسٹارٹ کر دیتا ہے، مالک کہتا ہے کہ چلاؤ، وہ چلانا شروع کر دیتا ہے۔ اب آپ کسی جگہ ڈرائیور کو روک کر کہیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور آپ نے گاڑی کیوں اسٹارٹ کی؟ تو وہ جواب دے گا کہ مجھے کیا معلوم؟ میں نے یہ کام اپنے ارادہ سے تھوڑی کیا ہے بلکہ مجھ سے کروایا گیا ہے، مجھے کہا گیا کہ یہ کام کروں لہٰذا میں نے کر دیا۔ اگر وجہ

پوچھنی ہے تو اس سے پوچھو جس نے مجھ سے یہ کام کروایا ہے، میرا تو اس میں نہ کوئی اختیار تھا اور نہ ہی میں نے اپنے انتخاب سے کیا۔ میری لگام کسی اور کے ہاتھ میں ہے، میں تو نوکر ہوں جو کچھ مالک مجھ سے کہے گا وہی کچھ انجام دوں گا۔ اسی طرح ذاتِ خداوند تعالیٰ کے مقابلے میں انسان عبدِ محض ہے، غلام ہے لہٰذا جو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم آتا ہے وہ بغیر چون و چرا اسے انجام دیتا ہے۔ فرض کریں کوئی آپ سے پوچھے کہ مغرب کی تین رکعت اور عشاء کی چار رکعت نماز کیوں پڑھتے ہو؟ آپ کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ نماز کی رکعتیں میں نے تھوڑی بنائی ہیں، میرا کام یہ ہے کہ اتنی ہی رکعتوں کو پڑھوں جتنی بتائی گئی ہیں، بنائی کسی اور نے ہیں وہی بہتر جانتا ہے کہ یہ تین کیوں ہیں اور وہ چار کیوں ہیں۔

عموماً وہ لوگ جو نماز نہیں پڑھتے ان کے لیے سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ مغرب کی تین رکعت کیوں ہیں؟ اور عشاء کی چار کیوں ہیں؟ جو لوگ نماز پڑھتے ہیں انہیں اس سے سروکار نہیں، وہ بس پڑھتے ہیں لیکن جو نماز نہیں پڑھتے ان کو یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے کہ فجر کی دو اور عشاء کی چار کیوں ہیں؟ یہ وضو اوپر سے کیوں ہوتا ہے؟ نیچے سے کیوں نہیں ہوتا؟ ہاتھ کیوں دھوتے ہیں اور پیر کیوں نہیں دھوتے؟ جس نے زندگی میں کبھی وضو نہیں کیا وہ زیادہ ہی یوں اور کیوں کے چکروں میں پڑا رہتا ہے لیکن جو کر رہے ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو خدا نے کہہ دیا ہے کہ ایسے کرو ہم ویسے کر رہے ہیں ہمیں کیا معلوم کیوں کر رہے ہیں؟ اس میں مصلحت تو ضرور ہے جو خدا کو معلوم ہے لیکن ہمیں نہیں معلوم۔ بہر حال عبدِ محض یہ نہیں پوچھتا کہ یہ ایسے کیوں ہے؟ وہ اپنے وظیفۂ شرعیہ پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ نماز ایک فریضہ ہے کہ انسان چون و چرا کے بغیر اس کو انجام دیتا ہے، کسی کو حق بھی نہیں کہ پوچھے نماز

کیوں واجب کر دی گئی ہے؟ اسی طرح بہت سارے وظائف ہیں جیسے روزہ ہے، حج ہے، حج کے اندر مختلف اعمال ہیں، ان کو فقط انجام دینا ہے لیکن ایسے کیوں انجام دیں تو یہ وہی جانتا ہے کہ جس نے یہ وظائف مقرر کیے ہیں۔ اسی طرح قیامِ مقدس امام حسین علیہ السلام ایک شرعی وظیفہ تھا جس پر آپؑ عمل پیرا ہوئے، خدا کی طرف سے فرمان آیا کہ آپ یہ کام کریں تو امام حسین علیہ السلام نے بھی امر خدا کو بجالاتے ہوئے یہ قیام فرمایا۔

۱۵۔ اتمام حجت

پندرہویں تفسیر اور حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے اس قیام کے ذریعے امت پر اتمام حجت کی ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس قیام میں ہم شہید ہو جائیں گے، اسیر ہو جائیں گے۔ آپ نے خود اپنے سفر کے آغاز میں اظہار فرمایا کہ ہمارے ساتھ یہ ہوگا۔ لوگوں نے روکا کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ شہید ہو جائیں گے اور آپ کے اہلِ خاندان اسیر ہو جائیں گے تو اس اقدام کی کیا ضرورت ہے؟ اس قیام کا فائدہ کیا ہے؟ انسان ایسے بہت سارے کام انجام دیتا ہے کہ جس میں بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا لیکن کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ انہیں کوئی یہ نہیں کہتا کہ آپ نے ہمیں بتایا نہیں تھا۔

بعض لوگ ہوتے ہیں جو وقت پڑنے پر اپنی گردن پر کچھ بھی نہیں لیتے لیکن جب موقع ہاتھ سے نکل جائے تو کہتے ہیں کہ ہمیں کیوں نہیں بتایا! فرض کریں ایک آدمی بیمار ہوا اور اس بیماری کی وجہ سے رحلت کر گیا، بعد میں بعض لوگ جب جنازے پر آتے ہیں اور ان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیمار تھا تو فوراً

کہتے ہیں بھائی اس کو ہسپتال کیوں نہیں لے گئے؟ میت کے وارث جواب دیتے ہیں کہ ہسپتال لے جاتے مگر ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا اس لیے نہیں لے جا سکے تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا، یہ تو آپ نے زیادتی کی ہے، آپ نے ہمیں اجنبی سمجھا ہے، کم از کم فون کرتے یا کسی بندے کو بھیج دیتے تو ہم کچھ نہ کچھ رقم ضرور دے دیتے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو موقع ہاتھ سے نکلنے پر کی جاتی ہیں۔ اگر موقع پر ان سے اسی مریض کے لیے مانگتے تو کہتے کہ آپ کو پتہ ہے آج کل روزگار تنگ ہے، پیسے نہیں ہیں، ہم تو خود محتاج ہیں، آپ نے بھی عجیب وقت میں سوال کیا، ہم خود آپ کے پاس مانگنے کے لیے آنے ہی والے تھے، اس حالت میں ہم آپ کی کیا امداد کر سکتے ہیں۔ اگر ان سے مانگ لیں تو یہ جواب ہے اور اگر نہیں مانگتے تو کہتے ہیں کہ ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ لہٰذا بہت ایسے سارے لوگ ہیں جو وقت گزرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ہمیں کہہ دیا ہوتا تو ہم وہ کرتے، ہم یہ کرتے۔

یہ بنی اسرائیلی صفت ہے۔ کچھ خاص عادتیں ایسی ہیں جو دوسری قوموں سے آ کر کسی قوم کے اندر سرایت کر جاتی ہیں، بہت زیادہ اسرائیلی صفات دوسری قوموں میں منتقل ہوئی ہیں، بنی اسرائیلی صفات جتنی مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں اتنی خود بنی اسرائیل میں بھی نہیں پائی جاتیں۔ بنی اسرائیلی صفات میں سے ایک یہی حجت بازی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ گائے ذبح کرو، اگر وہ سوچتے کہ وظیفۂ شرعیہ ہے تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، کوئی بھی ایک گائے ذبح کرتے تو مشکل حل ہو جاتی۔ جبکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بحث کرتے رہے کہ گائے کیسی ہونی چاہیے؟ کس رنگ کی ہو؟ نر ہو یا مادہ ہو؟ آیا ہل جوتنے والی ہو یا نہ ہو؟ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو نہ کہتے تو بعد میں کہہ دیتے کہ ہمیں کیوں نہیں بتایا، لیکن جب ان سے کہا تو بہانے ڈھونڈنے لگے لہٰذا ایسے بہانہ جُو صفت لوگوں پر حجت تمام

کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے ایک اور مقام پر بھی اس لجاج، ہٹ دھرم اور عجیب وغریب قوم کا تذکرہ کیا ہے۔ جب بنی اسرائیل بہت زیادہ ظلم وستم کا نشانہ بنے، حالات خراب ہوگئے، دہشت گردی عام ہوگئی، ان کو مارا جاتا تھا، گھروں سے نکال دیا جاتا تھا، ان سے مختلف قسم کے ٹیکس لیے جاتے تھے، انہیں اسیر اور غلام بنالیا جاتا تھا تو بنی اسرائیل ان حالات سے بہت تنگ آگئے اور زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگے، آخر کار ان کے سرکردہ لوگوں نے میٹنگ کی، قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ......[1]

کیا آپ نے موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت (کو پیش آنے والے حالات) پر نظر نہیں کی جس نے اپنے نبی سے کہا: آپ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کریں تاکہ ہم راہِ خدا میں جنگ کریں......

یعنی بنی اسرائیل کے سرکردہ افراد، سرغنے اور چوٹی کے لوگ جمع ہوئے انہوں نے میٹنگ کی اور اس میں کہا کہ یہ جو ہمارے نبی ہیں یہ ہمارے لیے کچھ بھی نہیں کرتے، ہم تو سب کے سب قربانی کے لیے تیار ہیں، سارا معاملہ اپنی گردن سے اتار کے تمام ذمہ داری نبی کی گردن میں ڈال دی اور بڑے بگڑے ہوئے جذبات اور جوش میں نبی سے کہنے لگے کہ آپ ہمارے لیے کچھ کام کریں، نبیؑ نے کہا کہ

[1]......سورۂ بقرہ، آیہ ۲۴۶

بتاؤ ہوا کیا؟ کیوں اتنے بگڑے ہوئے ہو؟ تو مچل کے کہنے لگے:

ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا.....

خدا سے کہو کہ ہمیں ایک جنگی کمانڈر چاہیے، قائد اور رہبر چاہیے جو صرف نماز ہی پڑھانے والا نہ ہو بلکہ ایسا ہو کہ جنگ میں ہماری رہنمائی اور قیادت بھی کر سکے، ہم بالکل تیار ہیں کوئی کمی نہیں، سب کچھ ہمارے پاس موجود ہے، افرادی قوت ہے، اسلحہ اور جوش و جذبہ ہے لہٰذا ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں، ایک چیز کی کمی ہے وہ یہ کہ ہمارا قائد رہنما اور کمانڈر نہیں ہے، آپ خدا سے کہہ دیں کہ ہمارے لیے ایک کمانڈر بھیج دے، پھر آپ دیکھیں گے کہ ہم کیا کچھ کریں گے۔ نبی نے ان کو سمجھایا کہ تم ایسے نہیں ہو، تمہارا یہ جذبہ وقتی طور پر ہے، بعد میں پشیمان ہو جاؤ گے لہٰذا یہ مطالبہ نہ کرو،

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا.....

کہا: ایسا نہ ہو کہ تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے اور پھر تم جنگ نہ کرو.....

اور اگر خدا تمہارا یہ مطالبہ پورا کر دے تو پھر تمہارا کیا بنے گا؟

تو انہوں نے جواب دیا کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم نہ لڑیں، ہمارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے، ہمیں اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے،

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا.....

کہنے لگے: ہم راہِ خدا میں کیوں نہ جنگ کریں جبکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے جدا کئے گئے ہیں؟.....

بس ایک رہبر کی ضرورت ہے پھر آپ دیکھیں ہم کیسے لڑتے ہیں۔ نبی خدا نے بارگاہِ خدا میں

عرض کی کہ یہ قوم مجھ سے یہ مطالبہ کر رہی ہے۔ اب اگر ان کو سمجھایا جاتا کہ ابھی یہ مطالبہ ترک کر دو، ابھی تم اس قابل نہیں ہو، ابھی تمہارے حالات صحیح نہیں ہیں، تم اتنے بالغ نہیں ہو کہ ایک رہبر الٰہی کو برداشت کر سکو اور اس کی قدر دانی کر سکو، اس کے پیچھے چل سکو، اس لیے کہ رہبر الٰہی کے پیچھے چلنا اتنا آسان کام نہیں ہے تو وہ لوگ کہہ دیتے کہ نہیں ہم بالکل آمادہ ہیں۔ اب اتمامِ حجت کی ضرورت تھی کیونکہ اگر خدا رہبر نہ بھیجتا تو یہ لوگ کہتے ہم نے اپنے نبیؐ کے ذریعے سے خدا سے رہبر مانگا تھا لیکن خدا نے نہیں بھیجا۔

خدا نے بھی اتمامِ حجت کے طور پر جناب طالوت کو رہبر کے عنوان سے مقرر کر دیا۔ اب طالوت خدا کے حکم سے ان کے رہبر اور عسکری کمانڈر مقرر ہوئے، جوں ہی جناب طالوت کا اعلان ہوا تو یہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ جلسہ ہم نے کیا! میٹنگ ہم نے بلائی! ساری زحمتیں ہم نے اٹھائیں اور پھر طالوت ہمارا کمانڈر ہو گیا! یہ نہیں ہو سکتا، ہماری مراد تو یہ تھی کہ ہم میں سے کسی ایک کو بنا دیتے، اس کا تو خاندانی حسب و نسب بھی اتنا بلند نہیں، غریب آدمی ہے مال دولت بھی نہیں رکھتا، معلوم نہیں کہاں کا ہے جانا پہچانا بھی نہیں اور نہ ہی کوئی سرکردہ شخصیت ہے لہٰذا ایک گروہ نے کہا کہ ہم طالوت کی معیّت میں نہیں لڑتے جبکہ دوسرے گروہ نے کہا کہ ہم نے تو خود مطالبہ کیا تھا، اب اس کے پیچھے چلنا پڑے گا ورنہ شرم کی بات ہے۔ کچھ اپنی شرم کے مارے چپ رہے، کچھ نے شرم کی بھی پرواہ نہیں کی، صاف کہہ دیا کہ ہم طالوت کو نہیں مانتے۔

جنابِ طالوت کے ساتھ چل پڑنے والا گروہ تھوڑا سا آگے چلا تو جنابِ طالوت نے انہیں کہا کہ دیکھو، ہم آسائش و آرام یا تفریحی سفر پر نہیں نکلے ہیں بلکہ جنگ کے لیے نکلے ہیں اور جنگ کے اپنے خاص قاعدے اور ضوابط ہوتے ہیں، آپ کو یہ ضوابط اپنانا پڑیں گے۔ لہٰذا جنگ کے ضوابط میں سے یہ

ہے کہ جب ہم کسی نہر پر پہنچیں (آج کی اصطلاح میں جب ہم کسی ''کے ایف سی'' یا ''میکڈونلڈ'' پر پہنچیں تو تمہاری رال نہ ٹپک پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ جب ہم کسی ریسٹورنٹ کے سامنے سے گزریں تو تمہاری رال ٹپکنا شروع ہو جائے۔) ہم جنگ کے لیے جا رہے ہیں ہمارا کام لڑنا ہے، اِدھر اُدھر نہیں دیکھنا، بہک نہیں جانا ہے۔ ایسے ہی ہوا، نہر پر پہنچے تو بہت تھکے ہوئے اور پیاسے تھے، ٹھنڈا پانی دیکھا تو بعض کا نہانے کو دل چاہ رہا تھا، بعض کا سونے کو جی چاہ رہا تھا، بعض کا پانی پینے کو دل چاہ رہا تھا،

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهُ مِنِّىْ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ...... [1]

جب طالوت لشکر لے کر روانہ ہوا تو اس نے کہا: اللہ ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے پس جو شخص اس میں سے پانی پی لے وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہوگا، مگر یہ کہ کوئی صرف ایک چلو اپنے ہاتھ سے بھر لے (تو کوئی مضائقہ نہیں)،......

پہلی شرط یہ ہے کہ پانی نہیں پینا، اگر پینا بھی ہے تو ایک چلو، اس سے زیادہ نہیں پینا۔ ایک چلو پی لو تب بھی مرو گے نہیں۔ لوگوں نے کہا، یہ کیسے ہو سکتا!؟ اتنا ٹھنڈا اور عمدہ پانی چھوڑ دیں؟! ہم کوئی خدا کی نعمتوں کو پامال کرنے والے ہیں؟! لہٰذا ان میں سے بعض نے جی بھر کے اتنا پانی پیا کہ اٹھنے کے قابل نہ رہے،

فَشَرِبُوا مِنْهُ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ......

---

[1]......سورۂ بقرہ، آیہ ۲۴۹

پس تھوڑے لوگوں کے سوا سب نے اس (نہر) میں سے پانی پی لیا.....

آدھے وہاں سے کٹ گئے فقط ایک تہائی لشکر جنابِ طالوت کے ساتھ گیا لیکن جب ان کی نگاہ جالوت اور جالوت کے مسلح لشکر پر پڑی تو پنڈلیاں کانپنے لگیں، مڑ کے جنابِ طالوت سے کہنے لگے کہ ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ اتنے خطرناک دشمن سے لڑنا ہے۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ ان کے پاس ڈنڈے ہوں گے لیکن یہ تو بہت مسلح ہیں، یہ تو آناً فاناً ہمارا کام تمام کر دیں گے، ہم ان سے نہیں لڑ سکتے۔

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهُ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ.....[1]

جب طالوت اور اس کے ایمان والے ساتھی (نہر) پار ہو گئے تو انہوں نے (طالوت سے) کہا: آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے.....

اس طرح وہ بھی واپس آ گئے اور جنابِ طالوت صرف چند ساتھیوں کے ہمراہ تنہا رہ گئے۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ.....[2]

لیکن جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے چند افراد کے سوا سب پھر گئے.....

یہ خدا کی طرف سے اتمامِ حجت تھی، اگر جنابِ طالوت کو ان کا رہبر نہ بنایا جاتا تو پھر کہتے کہ ہم تو تیار تھے صرف قائد نہیں تھا، قائد ہوتا تو دیکھتے کہ ہم کیا کرتے۔ لیکن جب طالوت آ گئے تو بنی اسرائیل نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔

آدھی قوم نہر پر بیٹھ گئی، آدھی قوم خوف کے مارے کانپنے لگی، آدھی قوم کہنے لگی کہ ہم سرے سے

---

[1].....سورۂ بقرہ، آیہ ۲۴۹

[2].....سورۂ بقرہ، آیہ ۲۴۶

ہی طالوت کو نہیں مانتے، یہ ہماری قوم کا آدمی نہیں ہے، یہ کوئی سرکردہ شخصیت نہیں ہے لہٰذا جنابِ طالوت تنہا رہ گئے۔ خدا نے جنابِ داؤد علیہ السلام کو طالوت کی مدد کے لیے بھیجا، حضرت داؤد علیہ السلام نے آکر جنگ کی اور جالوت کا سر قلم کر دیا لیکن بنی اسرائیل پر اتمامِ حجت ہوگئی لہٰذا کبھی اس طرح بھی اتمام حجت ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے درج کیا کہ اسرائیلی صفات خود ان سے زیادہ مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں، اب بنی اسرائیل ہنستے ہوں گے کہ دیکھو ہماری ساری صفات ان میں کیسے چلی گئیں؟ یہ ہمارے وارث کیسے نکلے؟ کوفیوں میں یہ اسرائیلی صفات کیسے سرایت کر گئیں؟ کوفہ کے سرکردہ افراد، چوٹی کی شخصیات میٹنگز (Meetings) کرتے رہے، باتیں کرتے رہے کہ یہ جو ہمارے ساتھ ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ ہمارا کوئی امام اور رہبر نہیں ورنہ افرادی قوت اور اسلحے کی کوئی کمی نہیں ہے، اگر ہمارا امام ہوتا تو پھر دیکھتے ہم کیا کرتے؟ ان یزیدیوں اور شامیوں کی ایسی مٹی پلید کریں گے کہ دوبارہ اٹھنے کے لیے ان میں جرأت ہی باقی نہ رہے گی۔

اُس زمانے میں ایسے بہت سارے لوگ تھے جو یہ کہتے تھے کہ بس کوئی ہمارا امام ہونا چاہیے تاکہ ہم میں ایک مرکزیت آجائے۔ پھر دیکھو ہم شامیوں کی کیسی درگت بناتے ہیں، شامی شام چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ لہٰذا اہلِ کوفہ نے امام حسین علیہ السلام کو متعدد خطوط لکھ کر آپؑ کو آنے کی دعوت دی، کہا کہ ہم پوری قوم آمادۂ نبرد ہے، صرف ایک چیز کی کمی ہے کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ تشریف لے آئیں، ہم آپؑ کی امامت اور رہبری کے زیرِ سایہ ان سارے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ہم یہ کر دیں گے، ہم وہ کر دیں گے۔ اب اگر امام حسین علیہ السلام ان کی دعوت کو قبول نہ کرتے اور اٹھ کر قیام نہ

کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ ہم تو قربانی کے لیے تیار تھے، ہم نے جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی لیکن امام نہیں آئے اور وہ گھر میں بیٹھے رہے۔ لہٰذا امام حسین علیہ السلام اتمامِ حجت کے لیے میدان میں آئے تا کہ کل کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ہمارا کوئی امام نہیں تھا۔ امام کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ساتھ چھوڑ جائیں گے لیکن یہ ثابت کہاں سے ہوتا کہ یہ چھوڑ جائیں گے، یہ اس وقت ثابت ہوتا ہے جب رہبر میدان میں تنہا ہو جائے، تا کہ امت پر حجت تمام ہو اور امت یہ کہنے کے قابل نہ ہو کہ ہم تو میدان میں تھے۔ آج امت یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہم تو میدان میں تھے لیکن امام نہیں تھا۔ لہٰذا فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام اتمامِ حجت ہے۔ جو بہت زیادہ ڈینگیں مارتے ہیں ان پر بھی حجت تمام ہو جاتی ہے۔[1]

کبھی یہ ڈینگیں خدا سن لیتا ہے اور پھر انسان خدا اور پوری دنیا کے سامنے رسوا و بے آبرو ہو جاتا ہے، جس طرح جنابِ طالوت کے ساتھی رسوا ہوئے اسی طرح کوفی اور بہت سارے دوسرے لوگ بھی رسوا ہوئے۔

فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ......[2]

---

[1]...... ڈینگیں مارنا کوفیوں کی عادت تھی، امیر المومنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: اَيُّهَا النَّاسُ الْمُجْتَمِعَةُ اَبْدَانُهُمْ، اَلْمُخْتَلِفَةُ اَهْوَاؤُهُمْ كَلَامُكُمْ يُوْهِي الصُّمَّ الصِّلَابَ وَ فِعْلُكُمْ يُطْمِعُ فِيْكُمُ الْاَعْدَاءَ تَقُوْلُوْنَ فِي الْمَجَالِسِ كَيْتَ وَ كَيْتَ، فَاِذَا جَاءَ الْقِتَالُ قُلْتُمْ حِيْدِ حِيَادِ...... (خطبہ ۲۹) اے وہ لوگو جن کے جسم یکجا اور خواہشیں جدا جدا ہیں، تمہاری باتیں تو سخت پتھروں کو بھی نرم کر دیتی ہیں اور تمہارا عمل ایسا ہے کہ جو دشمنوں کو تم پر دندان آز تیز کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اپنی مجلسوں میں تو تم کہتے پھرتے ہو کہ یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے اور جب جنگ چھڑ ہی جاتی ہے تو تم اس سے پناہ مانگنے لگتے ہو......

[2]...... سورۂ انعام، آیہ ۱۴۹

خدا کی حجت ہمیشہ تمام ہو کر رہے گی۔ لوگوں کی حجت کبھی بھی تمام نہیں ہوتی یعنی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بھی موقع دیا گیا ہوتا، مجھے بنایا ہوتا، مجھے یہ کہا گیا ہوتا تو میں یہ کر دیتا اور وہ کر دیتا۔

۱۶۔ دینِ خدا کی حفاظت

سولہویں تفسیر یہ ہے کہ دین کا وجود خطرے میں پڑا ہوا تھا، دین سرے سے نابود ہو رہا تھا اور مٹایا جا رہا تھا۔ بنی امیہ نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ دین کے تمام شعائر، دین کے تمام اصول و ارکان ختم کریں گے۔ انہوں نے ان شعائر کو ایک ایک کر کے ختم کرنا شروع بھی کر دیا تھا لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے دین کے تحفظ کی خاطر یہ کام کیا تا کہ دین کی اصل روح اور ارکان باقی رہیں۔ لوگ آگے پیچھے ہوتے رہتے ہیں، کسی زمانے میں دین دار پیدا ہوں گے، کسی زمانے میں بے دین پیدا ہوں گے لیکن اصل دین باقی رہے، لوگوں کی کوئی پروا نہیں۔

جیسے کہتے ہیں کہ قرآن باقی رہے اگرچہ غلاف میں ہی رہے، کسی زمانے میں کوئی پڑھنے والا آ ہی جائے گا۔ ضروری نہیں کہ ہر نسل کے افراد آ کر قرآن کھول کر پڑھیں بلکہ آئندہ کسی زمانے میں ممکن ہے قرآن پڑھنے والے پیدا ہو جائیں۔ اسی طرح دین باقی رہے اگرچہ مدرسوں میں، کتابوں اور لائبریریوں میں ہی کیوں نہ ہو، اگر اصل دین ختم ہو جائے تو پھر بعد میں آنے والے دین دار لوگوں کے لئے دین کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جیسا کہ آج کل ہمارے ملک کے اندر دین کی حکومت نہیں، کیونکہ اصل دین کتابوں میں، مدرسوں میں اور مساجد میں محفوظ ہے۔ روس کے اندر کچھ سال پہلے کتابوں اور عبادت گاہوں سے بھی دین ختم کر دیا گیا تھا۔ عبادت گاہوں کو اصطبل بنا دیا گیا تھا، لائبریریاں جلا دی گئیں

تھیں، مدرسے ختم کردیئے گئے تھے، مساجد مسمار کردی گئی تھیں یعنی کتابوں میں بھی دین غیر محفوظ تھا۔ بنی امیہ بھی اسی طرح چاہتے تھے کہ دین سرے سے ختم ہو جائے لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے یہ مقدس قیام فرمایا تاکہ دین محفوظ رہے۔

۱۷۔ زیادہ سے زیادہ ثواب دلوانا

امام حسین علیہ السلام کے مقدس قیام کی ایک حکمت اور تفسیر یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ امام حسین علیہ السلام بہت ہی دل سوز اور ہمدرد انسان تھے۔ جیسے کہتے ہیں کہ امام علیہ السلام خیر الانام ہیں یعنی ہمیشہ لوگوں کے لیے اچھائی اور نیکی کا سوچنا اور دوسروں کے فائدے کے لیے کوشش کرنا امام کا کام ہوتا ہے۔ بعض لوگ اپنے آپ کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کئے ہوتے ہیں، بعض صرف دنیاوی حد تک اور بعض نے اخروی فوائد کی خاطر بھی اپنے آپ کو وقف کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اس امت کو آخرت سنوارنے کے لیے ثواب کی ضرورت ہے، کیونکہ آخرت میں

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ٥ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ٥ [1]

پس جس کا پلہ بھری رہے گا۔ سو وہ من پسند زندگی میں ہوگا۔

وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ٥ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ٥ وَمَا أَدْرَاكَ مَاهِيَهْ٥ نَارٌ حَامِيَةٌ٥ [2]

اور جس کا پلہ ہلکا ہوگا۔ سو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا۔ اور آپ کیا جانیں ہاویہ کیا ہے؟۔ وہ بھڑکتی

۱.....سورۂ قارعہ، آیہ ۷، ۶ ۲.....سورۂ قارعہ، آیہ ۱۱-۸

ہوئی آگ ہے۔

لہٰذا امام حسین علیہ السلام یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ امتِ جد کا پلڑا ہلکا ہو بلکہ اس پلڑے کو بھاری کرنا ہے۔اب یہ پلڑا کس طرح سے بھاری ہوتا ہے؟ صرف ایک طریقہ ہے اور وہ ثواب کمانا ہے لہٰذا ثواب کمانے کے لیے بندوبست اور انتظام کیا جائے۔

نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے میں بھی ثواب ہے لیکن وہ اتنا زیادہ نہیں ہے، جیسا کہ تجارت پیشہ لوگ محاسبہ کرتے ہیں، اگر انہیں ایک روپے کے دس روپے مل رہے ہوں، کسی جگہ ایک روپے کے سو روپے مل رہے ہوں، تیسری جگہ ایک ہزار روپے مل رہے ہوں اور چوتھی جگہ ایک ملین روپے مل رہے ہوں تو بہترین تاجر وہ ہے جو ایک کے دس نہ کمائے بلکہ ایک کا ایک ملین کمائے۔اس لیے نمازیں اور روزے سب کچھ اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں لیکن نمازیں پڑھ پڑھ کے ثواب بناتے رہے تو لوگ تھک جائیں گے، پھر بھی معلوم نہیں کہ ثواب ملے یا نہ ملے، اس لیے کہ معلوم نہیں نمازیں قبول ہوئی ہیں یا نہیں؟ اس لئے نمازوں پر لوگوں کو نہیں چھوڑا جا سکتا ہے لہٰذا ثواب کی درآمد کا ایک ایسا مضبوط انتظام کیا جائے کہ نہایت آسانی سے زیادہ سے زیادہ ثواب ہاتھ آئے اس لیے امام حسین علیہ السلام ثواب ملنے کا انتظام کر کے گئے، وہ اس طرح کہ گویا امام حسین علیہ السلام نے کہا میں جا کر شہید ہوتا ہوں اور اپنے آپ کو ظلم وستم کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ وہ مجھ پر ظلم کریں، ظاہر ہے کہ جب مجھ پر ظلم کیا جائے تو میرے ماننے والوں کو دُکھ ہو گا، جب ان کے دل دکھیں گے تو روئیں گے اور رونے کا وہ عظیم ثواب ملے گا اور میں نہیں چاہتا کہ میرے جد کی امت اس ثواب سے محروم رہے۔اگر میں شہید نہیں ہوتا یا اگر معمولی طریقے سے شہید ہوتا ہوں تو یہ لوگ نہیں روئیں گے جیسا کہ دیگر معصومینؑ کی شہادت پر یوں نہیں روتے، باقی ائمہ علیہم السلام کی شہادت

زیادہ سے زیادہ ثواب دلوانا

پر ہم اس قدر کیوں نہیں روتے ؟اس لیے کہ ان کے ساتھ امام حسین علیہ السلام جیسا ظلم نہیں ہوا ہے، یہ ان کی ترجمانی ہے جو اس تفسیر کے قائل ہیں، ہاں اگر چہ روایات میں بھی آیا ہے کہ جو بھی سید الشہداء علیہ السلام پر روئے یا رلائے یا رونے کی شکل بنائے تو اس کو عظیم ثواب ملتا ہے یعنی اس پر جنت واجب ہے۔

۱۸۔ حالات کا صحیح اندازہ نہ لگانا

کربلا کے المناک واقعہ کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ امام علیہ السلام کو معاذ اللہ حالات کا صحیح اندازہ نہیں تھا، بعض محاسبات جو آپ نے انجام دیئے وہ درست ثابت نہیں ہوئے مثلاً آپ نے مدینہ سے مکہ کا رُخ کیا۔ امام حسین علیہ السلام نے یہ سوچا کہ لوگوں کی اکثریت یزید کے خلاف آواز اٹھائے گی اور یزید کی حکومت کو قبول نہیں کرے گی جبکہ ایسا نہیں ہوا بلکہ مسلمانوں کی اکثریت نے یزید کی حکومت کو قبول کرلیا، تھوڑے بہت جو مخالف تھے وہ بھی خاموش بیٹھے رہے اور مخالفت کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

امام علیہ السلام نے دوسرا اندازہ یہ لگایا تھا کہ اگر میں حج کے موسم تک مکہ میں رہوں اور تمام اسلامی بِلاد سے آنے والے حجاج اور سرکردہ افراد سے رابطہ کروں تو شاید یزید کے خلاف ایک بڑی تعداد کو مخالفت پر اُکسالوں۔ چنانچہ آپ نے چند ماہ مکہ میں قیام کیا اور اس دوران اہلِ مکہ اور باہر سے مکہ آنے والوں سے مسلسل رابطہ رکھا اور ہر ممکنہ طریقے سے انہیں یزید کی مخالفت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ اندازہ بھی درست ثابت نہیں ہوا۔ بہت کم تعداد نے مکہ میں آپ کا ساتھ دیا، اکثریت نے آپ کا ساتھ دینے سے اجتناب کیا بلکہ اپنی عبادت میں مصروف رہے۔

تیسرا اندازہ جو درست ثابت نہیں ہوا وہ یہ تھا کہ مدینہ اور مکہ میں موجود کئی اور بڑی شخصیات نے بھی یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ ان میں سے بعض کے بارے میں یزید نے اپنی حساسیت کا اظہار بھی کیا جیسے عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ۔ امام علیہ السلام نے اس نیت سے قیام کیا کہ بڑی اور سرکردہ شخصیات جو یزید کی مخالف بھی ہیں اس قیام میں میرا ساتھ دیں گی جبکہ ایسا نہیں ہوا بلکہ انہوں نے امام علیہ السلام کو بھی اس امر سے روکا اور اس کے انجام کی طرف توجہ دلائی۔

چوتھی چیز جو درست ثابت نہیں ہوئی وہ یہ تھی کہ امام علیہ السلام نے یہ سوچ کر قیام کیا کہ میں نواسۂ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں اور حالات جیسے بھی ہوں، حکمران جو لوگ بھی ہوں لیکن اس رشتے کا لحاظ کریں گے خصوصاً یزید جتنا بھی بے دین ہو وہ اتنے مسلمانوں کی موجودگی میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے اور خاندان کو تکلیف پہنچانے سے اجتناب کرے گا۔ یہ بھی نہیں ہوا بلکہ یزید اور کوفہ و شام کے لوگوں نے آپؑ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرابت کا کوئی پاس و لحاظ نہیں کیا اور آپؑ کو شہید کر کے آپؑ کے خاندان کو اسیر بنالیا۔

ایک اور فرض جو بعد میں درست ثابت نہیں ہوا وہ یزید کے بارے میں یہ سوچ رکھنا تھا کہ یزید بھی اپنے باپ کی طرح رواداری سے کام لے گا جس طرح معاویہ نے امام حسن علیہ السلام سے صلح کر لی اور امام حسین علیہ السلام کو بھی کبھی بیعت پر مجبور نہیں کیا، اگرچہ وہ در پردہ دشمنی رکھتا تھا لیکن بظاہر آپؑ کا احترام کرتا تھا، امام علیہ السلام نے سوچا کہ یزید بھی ایسا ہی ہوگا، تمام تر دشمنی کے باوجود اتنی گھناؤنی جنایت انجام نہیں دے گا جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس یزید نے ہر چیز کو بالائے طاق رکھ کر کربلا میں آپؑ کو شہید کروادیا۔

اس تفسیر میں سب سے بڑھ کر جس چیز کو سند کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہ ان کے بقول کوفہ والوں کے بارے میں امام علیہ السلام کا صحیح اندازہ نہ ہونا ہے۔ کوفہ میں امیر المومنین علیہ السلام سے عقیدت رکھنے والے بہت سے لوگ موجود تھے، وہاں ایک بڑی تعداد امامت پر اعتقاد رکھنے والوں کی بھی موجود تھی جو امام حسین علیہ السلام کو ہی حقیقی جانشینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھتے تھے۔ اس پر مزید یہ کہ انہوں نے امام علیہ السلام کو خطوط بھی روانہ کئے، بعض مورخین نے ان کی تعداد اٹھارہ ہزار تک نقل کی ہے۔ ان خطوط میں انہوں نے امام علیہ السلام کو دعوت دی، اپنی وفاداری کا یقین دلایا، حالات کے مُساعِد ہونے کی خبر دی، ہر کام کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور جنگ کے لیے اپنے اسلحے وساز وسامان کا تذکرہ کیا۔

امام علیہ السلام نے ان تمام امور کی تصدیق کے لیے جناب مسلم بن عقیلؑ کو اپنا سفیر ونمائندہ بنا کر روانہ کیا۔ کوفہ والوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور انہیں مدد کا یقین دلایا چنانچہ جناب مسلم بن عقیل ؑ نے آپ کو خط کے ذریعے مطلع فرمایا اور حالات کو قیام کے لیے مناسب گردانا۔ سید الشہداء علیہ السلام نے ان تمام قرائن اور شواہد کی روشنی میں فیصلہ کیا کہ کوفہ جا کر اہلِ کوفہ کی مدد سے یزید کے خلاف ایک باقاعدہ قیام کا آغاز کیا جائے۔ چنانچہ آپ اہلِ مکہ سے مایوس ہو کر اور اہلِ کوفہ پر بھروسہ کر کے آٹھ ذی الحجہ کو احرام کھول کر کوفہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مکہ سے روانگی کے موقع پر بھی کئی افراد نے سید الشہداء علیہ السلام کو اس اقدام سے باز رہنے کی تلقین کی، ان میں دنیائے اسلام کی کئی برجستہ شخصیات بھی موجود تھیں۔ ان لوگوں نے آپ کو کوفہ والوں کی بے وفائی، سستی اور ماضی میں امیر المومنین علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام کے ساتھ اہل کوفہ کے رویّے کی طرف متوجہ بھی کیا، سب نے آپ سے یہی کہا کہ کوفہ والوں پر بھروسہ نہ کیجئے، یہ کسی حوالے سے بھی قابلِ اعتماد نہیں ہیں لیکن امام حسین علیہ السلام نے یہ سب باتیں سنی ان سنی کر دیں اور کوفہ جانے

حالات کا صحیح اندازہ نہ لگانا

کاارادہ کرلیا۔ چنانچہ جب آپ کوفہ کے قریب پہنچے تو راستے میں کوفہ سے آنے والے افراد سے آپؑ کی ملاقات ہوئی، انہوں نے آپؑ کو کوفیوں کے کردار سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مسلم بن عقیلؑ اور ہانی بن عروہؑ شہید ہو چکے ہیں، چند افراد اسیر ہیں اور باقی سب گھروں میں جا بیٹھے ہیں، خوف و ہراس کی وجہ سے اکثر لوگ عبیداللہ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں، ممکن ہے ان کے دل آپ کے ساتھ ہوں لیکن فی الحال ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں، کوفہ مکمل طور پر عبیداللہ کے قبضے میں ہے، امام علیہ السلام نے اسی منزل سے اپنا راستہ نامعلوم منزل کی طرف تبدیل کر دیا۔

یہاں پہنچ کر امام علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ اصلی سہارا جس پر بھروسہ کر کے روانہ ہوئے تھے ہاتھ سے نکل گیا اور آپ نے جان لیا کہ اہلِ کوفہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس تفسیر کے مطابق امام علیہ السلام کے قیام یا شہادت کے پیچھے یہ عنصر بھی کارفرما تھا کہ آپؑ نے حالات، شخصیات، حکمرانوں یا عوام کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ حقائق کے مطابق نہیں تھی۔ اس تفسیر کی طرف رجحان رکھنے والوں میں ''شہید جاوید'' نامی کتاب کے مؤلف بھی ہیں البتہ ان کے علاوہ بھی ایسے افراد ہیں جو یہی تفکر رکھتے ہیں۔

طبقاتی جنگ

۱۹۔ طبقاتی جنگ

الف: قبائلی جنگ

ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ یہ طبقاتی جنگ تھی، اس کو دو طرح سے بیان کیا گیا ہے، ایک اس طرح کہ یہ دو قبیلوں یعنی بنی ہاشم اور بنی امیہ کی جنگ تھی، یہ دو خاندان اسلام سے پہلے بھی آپس میں لڑ رہے

تھے، کبھی کعبہ کی چابیوں کے معاملے پر، کبھی زمزم کے معاملے پر اور کبھی تجارت کے مسائل پر ان کی آپس میں لڑائی ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب دو قبیلے ایک چھوٹے سے شہر میں ہوں، ہر ایک یہی چاہتا ہو کہ ہماری بات چلے تو پھر بات بات پر لڑائی جھگڑے واقع ہوتے رہتے ہیں لہٰذا بنی ہاشم اور بنی امیہ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی آپس میں لڑتے رہے، کبھی بنی ہاشم غالب رہتے اور کبھی بنی امیہ غالب ہو کر بنی ہاشم کو میدان سے نکال دیتے، لیکن جب اسلام آ گیا تو بنی امیہ اسی خاندانی دشمنی کی وجہ سے اسلام کے سخت مخالف ہو گئے، پھر ان کے درمیان جنگیں شروع ہوئیں۔ جنگِ بدر، جنگِ احد، جنگِ خندق وغیرہ بھی درحقیقت ان دو خاندانوں کی جنگیں تھیں، اگرچہ اسلام سے پہلے بہانے اور ہوتے تھے لیکن اسلام آنے کے بعد اب مذہب بہانہ بن گیا۔

واقعۂ کربلا بھی اتنی اہمیت کی جنگ نہیں بلکہ پہلے سے برسرِ پیکار دو خاندانوں کی جنگ تھی۔ اس تفسیر کے قائلین اپنے مدعا کے لیے شاہد بھی پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھیے حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی جنگوں میں ہر جگہ شجاعت کے جوہر دکھاتے ہیں، ہر جنگ میں شریک نظر آتے ہیں، آپؑ کی شجاعت اتنی مشہور ہوگئی کہ جس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ آپؑ نے ان جنگوں میں ایسی شمشیر چلائی کہ جس کی مثال رہتی دنیا تک نہیں ملتی لیکن علی علیہ السلام جیسے شجاع جنگجو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خاموش ہی نظر آتے ہیں، پھر آپ نے وہ شمشیر نہیں چلائی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں چلاتے تھے۔ خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کا زمانہ آپ علیہ السلام کے سکوت اور خاموشی کا زمانہ ہے، حالانکہ خلیفہ دوم کا زمانہ فتوحات اور جنگوں کا زمانہ تھا، خلیفہ اول کے زمانے میں بھی بعض جنگیں ہوئیں لیکن خلیفہ دوم کے زمانے میں بڑی بڑی جنگیں ہوئیں ہیں، ایران اور روم یعنی اس زمانے کی دو سپر طاقتوں کو شکست دے

کران کو فتح کیا گیا لیکن ان جنگوں میں حضرت علی علیہ السلام کا کوئی کردار نظر نہیں آتا، آپؑ رومیوں اور ایرانیوں کے خلاف تلوار چلاتے ہوئے نظر نہیں آتے کیونکہ حضرت علی علیہ السلام نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ میں نے لڑنا ہے تو اپنے مخالف قبیلے کے ساتھ لڑنا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں جو چند جنگیں ہوئیں ان میں مخالف قبیلے کے لوگ تھے، جنگ بدر میں بنی امیہ تھے، جنگ احد اور جنگ خندق میں بنی امیہ تھے لہٰذا بنی امیہ کے خلاف لڑے لیکن جب اسلام نے مکہ فتح کر لیا تو بنی امیہ کے ساتھ ظاہری طور پر جنگ ختم ہوگئی، چونکہ وقتی طور پر بنی امیہ مغلوب ہو گئے اور بنی ہاشم کا غلبہ مان لیا لہٰذا فتح مکہ کے بعد والی جنگوں میں چونکہ بنی امیہ نہیں تھے جیسے روم اور ایران کی جنگوں میں تو جبھی آپ نے شرکت بھی نہیں کی۔ پھر جب حضرت علی علیہ السلام نے حکومت سنبھالی تو بنی امیہ آپ سے لڑنے لگے، آپ نے بھی ان کے خلاف خوب شمشیر چلائی، آپ کے خلافت سنبھالتے ہی حریف قبیلہ میدان میں اُتر آیا۔ یہاں سے بنی ہاشم بھی میدان میں اترے، جنگِ صفین میں بنی امیہ سامنے آئے جبکہ جنگِ نہروان اور جنگِ جمل میں بنی امیہ پس پردہ تھے۔ یوں کہہ لیں کہ دونوں خاندانوں کے سرکردہ افراد ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے اور ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں پورے عرب میں ابوسفیان سخت مخالف رہا، فتحِ مکہ سے پہلے ہر جنگ میں شریک رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف لوگوں کو ابھارتا رہا، اسلحہ جمع کرتا رہا لیکن آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں مغلوب ہو کر تسلیم ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بنی امیہ نے پھر سر اٹھانے کی کوشش کی اور خلیفہ سوم کے زمانے میں ان کو پھر سے اپنی دست رفتہ قوت جمع کرنے کا موقع ملا جس کے نتیجے میں معاویہ ابن ابی

سفیان، حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ مقابلہ کے لیے تیار ہوا، ان کے درمیان سخت جنگیں ہوئیں لیکن حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد بنی ہاشم سیاسی میدان سے وقتی طور پر باہر نکل آئے اور بنی امیہ مکمل طور پر قابض نظر آئے۔

معاویہ کے مرنے کے بعد بنی ہاشم نے پھر سر اٹھانے کی کوشش کی، بنی امیہ کا سرکردہ شخص معاویہ کا بیٹا یزید تھا اور یہاں بنی ہاشم میں سے حضرت امام حسین علیہ السلام تھے، دونوں کا زبردست مقابلہ ہوا لیکن بنی امیہ نے یہاں پر بنی ہاشم پر ایسا وار کیا کہ بنی ہاشم کو سیاسی میدان سے نکال کر خود تمام اسلامی سلطنت پر قابض ہوئے۔ یہ ساری باتیں بعض عرب مصنفین اور بعض غیر مسلم مصنفین نے ان دو خاندانوں کے متعلق لکھی ہیں۔

ب: تاریخی تضاد اور ٹکراؤ

طبقاتی جنگ کی دوسری وجہ اور تفسیر زیادہ تر روشن فکری کے ساتھ بیان کی گئی ہے، اس تفسیر کے مفسرین کہتے ہیں کہ تاریخ کا اپنا ایک تسلسل ہے جو تاریخ کے اندر کے تضاد سے آگے بڑھتا ہے، اسی تاریخی تضاد سے انقلاب رونما ہوتے ہیں، معاشروں کے اندر تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، غالب مغلوب بن کر اور مغلوب غالب بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس کا بہترین نمونہ مارکسزم (Marxism) اور کیمونزم (Communism) ہے، اس تاریخی تضاد کے نتیجہ میں جنگیں بھی واقع ہوتی ہیں، اس میں ہوتا یہ ہے کہ معاشرے میں ایک طبقہ پیدا ہوتا ہے جو سرمایہ دار ہوتا ہے، اس سرمایہ دار طبقہ کی ایک مدت تک حکومت ہوتی ہے، پھر اس مُرَفّہ حال طبقے کے خلاف بغاوتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ مخالفین سر اٹھاتے

ہیں، برسر اقتدار طبقہ سے ٹکراتے ہیں اور ٹکرانے کے بعد اس پر غلبہ پا لیتے ہیں، پھر کچھ عرصہ یہ برسر اقتدار رہتے ہیں اور انقلابی بن کر اقتدار پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ رہنے کے بعد آہستہ آہستہ یہ سب خود سرمایہ دار بننا شروع ہو جاتے ہیں، یہی انقلابی لوگ محلات بنانا شروع کر دیتے ہیں، نئے نئے ماڈلز کی گاڑیاں خریدتے ہیں اور وہی عیاشیاں خود شروع کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد ان کے خلاف لوگ اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں اور اسی طرح یہ تسلسل جاری رہتا ہے۔

انہوں نے کربلا کی جنگ کی بھی یہی تفسیر پیش کی ہے کہ یہ ایک طبقاتی جنگ ہے جو اسی تاریخی تسلسل کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ تاریخ میں ایک جاہلیت کا زمانہ تھا، جاہلیت کے رسوم و رواج حکم فرما تھے، پھر اسلام آیا تو جاہلیت کا خاتمہ ہوا۔ اسلام جب عروج پر پہنچا تو اس کے خلاف بنی امیہ پیدا ہوئے، انہوں نے خلافت پر قبضہ جما لیا، بنی امیہ اپنے عروج پر پہنچے تو ان کے خلاف بنی عباس اٹھے پھر بنی عباس اپنے عروج پر پہنچے تو ان کے اندر خود ہی بغاوت شروع ہو گئی، ان کے بعد فاطمی سادات آ گئے، فاطمیوں کے بعد عثمانی آ گئے، عثمانیوں کے بعد یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے وجود میں آئے، اسی طرح یہ ایک تسلسل ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

تاریخی تضاد اور ٹکراؤ

اس نظریے کے مطابق کربلا کا واقعہ بھی حاکم طبقہ کے خلاف ایک طبعی ٹکراؤ تھا۔ اسی تضاد کے نتیجے میں یہ جنگ واقع ہوئی، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، معاشرے میں ہمیشہ ایسا ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر امام حسین علیہ السلام یہ قیام نہ کرتے تو کوئی اور آ کر بنی امیہ کے خلاف اٹھتا، اس لیے کہ یہ کام ہونا ہی تھا کیونکہ یہ تاریخی تسلسل ہے۔ جیسا کہ کسی استاد نے اپنے شاگرد سے پوچھا کہ اگر ایڈیسن بجلی استخراج نہ کرتا تو کیا ہوتا؟ شاگرد نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ہوتا، کوئی اور آ کر بجلی استخراج کرتا۔ لہٰذا اگر آج

کوئی ظلم کے خلاف نہیں اٹھا تو کل کوئی اور ضرور اٹھے گا۔

۲۰۔ مزاج کی تندی

سید الشہداء علیہ السلام کے قیام کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ کربلا کے واقعہ کا اصلی محرّک امام حسین علیہ السلام کے مزاج کی تُندی ہے۔ بعض لوگ اس مطلب کو گستاخانہ انداز میں بیان کرتے ہیں اور بعض محترمانہ طور پر۔ گستاخانہ انداز کا ایک نمونہ پاکستان کی مشہور شخصیت ڈاکٹر اسرار احمد ہیں جنہوں نے ایک ٹی وی پروگرام میں بعض دیگر علماء کی موجودگی میں اس سوال کے جواب میں کہ واقعۂ کربلا کا اصلی محرک کیا ہے؟ جواب دیا کہ

> کئی شخصیات نے امام حسین علیہ السلام کو اس اقدام سے روکا اور اس قیام کے نتائج کی طرف توجہ دلائی لیکن ''مزاج کی ہٹ دھرمی'' کی وجہ سے آپ نے کسی کی بات نہیں مانی، جبکہ نتیجہ ویسا ہی نکلا جس کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔

بعض تو اس خدشے سے بھی آگے بڑھ کر آج بھی وہی تفسیر و تعبیر کرتے ہیں جو یزید نے کی تھی کہ سرے سے یہ قیام تھا ہی غیر شرعی، کیونکہ حکومتِ وقت کے خلاف ہر قسم کا قیام و شورش بغاوت ہے، آج بھی بعض افراد اسی قسم کے اظہارات رکھتے ہیں۔ محترمانہ انداز میں مذکورہ تفسیر کرنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔

خصوصیت کے ساتھ یہ تفسیر اس موقع پر کی جاتی ہے جب امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے

کردار و سیرت میں تقابل کیا جاتا ہے۔ اگر چہ اپنی جگہ پر یہ سوال کئی جہات سے اہمیت کا حامل ہے کہ ایک ہی حکومت کے خلاف ایک بھائی صلح کرتے ہیں اور دوسرے جنگ کرتے ہیں، آیا دونوں بھائیوں کی سوچ یا سیرت و کردار کا فرق تھا یا کوئی اور وجہ تھی؟ ہر ایک نے اپنی ذہنیت کے مطابق اس سوال کا جواب دیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ دونوں بھائیوں کے زمانے اور حالات میں فرق ہے۔ ایک جواب یہ بھی ہے کہ اس صلح و جنگ کی وجہ معاویہ اور یزید کے کردار و سوچ کا فرق ہے وغیرہ۔ لیکن ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ امام حسن علیہ السلام کے مزاج میں نرمی، ہمدردی، امن پسندی اور مہربانی و صلح طلبی پائی جاتی تھی جس کے بہت سارے شواہد بھی پیش کئے جاتے ہیں جبکہ اس کے برخلاف امام حسین علیہ السلام کے مزاج میں تندی، سختی اور جنگ جوئی کی خُو موجود تھی اور اس کے بارے میں بھی کافی شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔

ایک تعبیر یہ بھی کی جاتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شخصیت میں انقلابی جذبات پائے جاتے تھے جبکہ امام حسن علیہ السلام ایسے نہیں تھے۔ بعض لوگ اسی مطلب کو عرفانی زبان میں بیان کرتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام خدا کی رحمت و جمال کا مظہر اور آیت تھے جبکہ امام حسین علیہ السلام خدا کے غضب، انتقام و جلال کا مظہر اور آیت تھے۔

حضرت امام خمینیؒ کی قیادت میں انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد یہ بحث زوروں پر رہی ہے کیونکہ تمام ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا تھا کہ ایک مجتہد نے قیام کیا ہے، انقلاب برپا کیا ہے اور ظالم کو سرنگوں کیا ہے جبکہ دوسرے علماء و مجتہدین کی طرف سے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اس مقام پر شیعہ تین حصوں میں تقسیم ہو گئے، ایک طبقہ نے امام خمینیؒ کے عمل کو سراہا اور باقی غیر انقلابی علماء کے عمل کو پسند نہیں کیا۔ ایک طبقہ نے ساکت اور خاموش علماء کی حمایت کی اور امام خمینیؒ کی بھرپور مخالفت کی لیکن ایک بڑا

طبقہ وہ تھا جو دونوں کا احترام کرتا تھا، امام خمینیؒ کو بھی ایک انقلابی رہبر کے طور پر مانتے تھا اور دیگر علماء کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ایسے افراد کو اس سوال کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا کہ یہ تضاد کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ اہلِ قیام و مبارزہ بھی درست ہوں اور اہلِ سکوت و جمود بھی درست ہوں؟ تنہا جواب اس سوال کا یہی دیا جاتا تھا کہ امام خمینیؒ سیرتِ حسینیؑ پر چل رہے ہیں اور باقی بزرگان سیرتِ حسنیؑ پر عمل پیرا ہیں۔

یہ جواب دراصل اسی تفسیر سے متاثر ہے اور یہیں سے لیا گیا ہے کہ یہ دو کردار دو ائمہ علیہم السلام کی طرف سے ہیں کہ ایک امامؑ انقلابی اور اہلِ جہاد و قیام ہیں جبکہ دوسرے اہلِ وحدت و اتحاد اور صلح و امن کے خواہاں ہیں۔ یہ تاریخی معمہ اپنی جگہ پرمحلِ بحث واقع ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرق دو بھائیوں میں نہیں بلکہ اُمت کے کردار کا ہے۔ [1]

---

[1]......اس بحث کے لیے کتاب فلسفۂ صلح امام حسنؑ کی طرف رجوع کیا جائے۔

چوتھی فصل:

صحیح تفسیر کی ضرورت
اور
اس کا معیار

اہم نکات

قیامِ مقدس حضرت امام حسین علیہ السلام کی صحیح تفسیر کرنے سے پہلے چند اہم نکات کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

◄◄ پہلا نکتہ ⇦ تفاسیر کا نامکمل اور قابل اصلاح ہونا

اس سے پہلے کہ ہم کربلا کی صحیح تفسیر کا معیار بتائیں اور پھر مقامِ تفسیر میں آ کر اس کی تفسیر کریں اس نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ ابھی تک جو تفاسیر ہم نے ذکر کی ہیں ان میں سے اکثر سو فیصد غلط ہیں البتہ بعض تفاسیر جزوی طور پر صحیح بھی ہیں یعنی علّتِ ناقصہ کے طور پر قابلِ قبول ہیں، بعض اگرچہ درست ہیں لیکن انہیں تکمیل کی ضرورت ہے لیکن تفسیر تام اور تفسیر کامل کے طور پر ہم ان کو بھی نہیں مان سکتے۔ ہم ایک ایسی جامع تفسیر بیان کریں گے جس سے گذشتہ تمام تفاسیر کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار بھی معلوم ہو جائے گا۔ پڑھنے والے خود ہی اندازہ لگا سکیں گے کہ گذشتہ تمام تفاسیر کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہیں۔

ہم نے صرف تفاسیر کی فہرست ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے گذشتہ تمام تفاسیر پر تنقیدی جائزہ لینے سے گریز کیا ہے ورنہ بعض تفسیریں تو نہایت ہی خام اور ظالمانہ تفسیریں ہیں جو کربلا کے دشمنوں نے کی ہیں مثلاً طبقاتی تفسیر، تفسیر تقدیر و قسمت، لاعلمی اور مزاج کا فرق وغیرہ۔ بعض تفسیریں اس مکتب سے عقیدت رکھنے والوں نے کی ہیں لیکن وہ بھی ناقص ہیں اور ان کو

اصلاح کی ضرورت ہے۔ہم جو جامع تفسیر ذکر کریں گے اس سے قابلِ اصلاح تفاسیر کی اصلاح اور قابلِ رد تفاسیر کا رد ثابت ہو جائے گا۔

دوسرا نکتہ ⇦ صحیح تفسیر کی ضرورت

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ کربلا کی صحیح تفسیر بیان کرنے کی اشد ضرورت ہے ورنہ اگر ہم نے کربلا کی صحیح تفسیر پیش نہ کی تو یہ نہیں ہے کہ دوسرے ہمارے منتظر بیٹھے رہیں گے اور وہ اپنی تفاسیر لوگوں کے سامنے پیش نہیں کریں گے بلکہ دوست اور دشمن اپنی مرضی سے تفسیر کرتے رہیں گے، اگر ہم خول میں گھسے رہیں تو دوسرے تو خول میں نہیں ہیں بلکہ وہ خول سے باہر آ چکے ہیں لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ ہم درست نقطۂ نظر بیان کریں ورنہ لوگ تحریف کریں گے۔اس قیام کو بیان کرنا، اس کو سمجھنا، اس کی اشاعت کرنا، اس کی ترویج کرنا اور اس کی حقیقت تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔

اگر ہم نے یہ اقدام نہ کیا تو ہماری حالت بھی کچھوے کی حالت جیسی ہوگی۔ کچھوے کی پشت پر ایک خول ہوتا ہے، جوں ہی کوئی خطرہ محسوس کرتا ہے تو فوراً اپنی گردن سمیٹ کر خول کے اندر چھپ جاتا ہے، کچھوا جب خول کے اندر آ جائے تو سمجھتا ہے کہ پوری دنیا میں امن و امان ہے، اب کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خول کے اندر چھپنے کے باوجود کسی شکاری کے ہاتھ آ جاتا ہے اور اس کو اس وقت تک پتہ نہیں ہوتا جب تک خول سے باہر نہیں آتا۔ جب خول سے باہر آتا ہے تو اپنے آپ کو شکاری کے دام میں پھنسا ہوا پاتا ہے، لہٰذا اگر ہم نے بھی خول میں گھسنے کی کوشش کی تو شکاری تو آرام سے نہیں بیٹھتے ہوئے، وہ سب کچھ شکار کر جائیں گے۔ کربلا جیسی روئیداد کی ایسی تفسیر پیش کریں گے جو اس

قیام کو سرے سے نابود کرنے کے مترادف ہوگی۔ گذشتہ تفاسیر میں سے چند ایک ایسی تفسیریں ہیں جو بہت مغرضانہ اور سوءِ نیت کے ساتھ اس مکتب کے دشمنوں نے کی ہیں۔

تیسرا نکتہ ⇦ صحیح تفسیر کرنے کا معیار

فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام کو بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے ایک معیار معین کرنا چاہیے۔ کسی بھی نظریہ کو رد کرنے یا قبول کرنے کا اپنا ایک خاص معیار ہوتا ہے۔ یوں نہیں کہ مختلف آراء میں سے جس رائے کے بارے میں زیادہ روایات موجود ہیں ہم اس کو لے لیں یا یہ کسی بزرگ ہستی نے کہا ہے اس لیے ہم اس کو قبول کر لیں مثلاً یہ فلاں محترم اور محقق کا نظریہ ہے لہٰذا اس کو قبول کرنا ہے، اس طرح نہیں بلکہ ایک خاص معیار کے تحت نظریات کو پرکھا جاتا ہے، جو بھی نظریہ اس معیار کے مطابق ہو وہ قابلِ قبول ہوگا اور جو بھی اس معیار سے ہٹ کر بیان کیا گیا ہو وہ نظریہ قابلِ قبول نہیں۔ جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں تو اگرچہ نماز کے تمام ظاہری احکام صحیح طور پر انجام دیتے ہیں، صحیح طریقے سے وضو کرتے ہیں، پاک لباس کے ساتھ دیگر تمام شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے صحیح طریقے سے نماز پڑھتے ہیں لیکن دل میں پھر بھی شک کرتے ہیں اور کھٹکا رہتا ہے کہ نماز قبول بھی ہوئی ہے کہ نہیں۔ پھر اس کو آخرت کے لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہاں معلوم ہو جائے گا کہ قبول ہوئی یا نہیں۔

سوال یہ ہے کہ آیا ایسا کوئی معیار ہے جس سے ہم پرکھ سکیں اور اس دنیا میں ہی معلوم ہو جائے کہ نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں؟ کہتے ہیں ہاں نماز کے لیے ایسا معیار ہے کہ جس سے معلوم کر سکتے ہیں کہ نماز قبول بھی ہوئی یا نہیں اور وہ معیار یہ ہے کہ نماز کے لیے قرآنِ کریم اور احادیث میں

کچھ اثرات بیان کئے گئے ہیں، اگر یہ اثرات پائے جاتے ہوں تو نماز قبول ہوئی ہے ورنہ نہیں، باقی سارے اعمال کی قبولیت کا دارومدار نماز پر ہے، اگر نماز قبول ہوئی تو باقی اعمال بھی قبول ہوں گے ورنہ نہیں۔ بہرحال نماز کی قبولیت کا معیار یہی ہے کہ نماز کے آثار کو دیکھنا چاہیے، منجملہ آثار میں سے ایک اثر یہ ہے:

اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ .....[1]

بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے.....

یہ قبول شدہ نماز کا اثر ہے، نماز کی قبولیت کا ایک پیمانہ ہے۔ اگر نماز پڑھنے کے بعد، دوسری نماز کے پڑھنے تک انسان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور وہ کسی فحشاء اور منکر کا مرتکب نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ نماز قبول ہوئی ہے ورنہ نہیں۔ دوسرا اثر یہ بیان کیا گیا ہے:

اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمَنِ .....[2]

نماز مومن کی معراج ہے۔

یا یہ دوسری حدیث:

اَلصَّلٰوةُ قُرْبَانُ كُلِّ تَقِيٍّ.....[3]

نماز ہر متقی کے لئے باعثِ تقرب ہے۔

یعنی نماز پڑھنے سے اگر ہم اللہ کے قریب ہوئے ہوں تو نماز قبول ہے ورنہ نماز پڑھتے ہوئے

---

[1].....سورۂ عنکبوت، آیہ ۴۵ [2].....اصولِ کافی، جلد ۳، صفحہ ۴۸۵ [3].....نہج البلاغہ، حکمت ۱۳۶

پھر بھی خدا سے دور ہی ہوں، خدا کو فراموش کیا ہوا ہو اور اپنی ہویٰ و ہوس میں مبتلا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ نماز قبول نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام اثرات نماز کے فقط ظاہری احکام اور آداب بجالانے سے مترتب نہیں ہوتے بلکہ ہوسکتا ہے کہ خود برائی کا باعث بنیں مثلاً غصبی پانی سے وضو کر کے نماز پڑھنا اور غصبی مکان میں نماز پڑھنا انسان کو برائی سے کیسے بچاسکتے ہیں جبکہ یہ خود ہی برائیاں ہیں۔ جو چیزیں انسان کو برائیوں سے بچاتی ہیں وہ اسرارِ نماز ہیں، جب انسان اسرارِ نماز اور روحِ نماز سے واقف ہو جائے اور پھر نماز پڑھے تو وہ ہرگز برائیوں کے قریب نہیں جاتا۔ لہٰذا نماز کے دو رُخ ہیں، ایک ظاہرِ نماز ہے اور ایک باطنِ نماز ہے، جو ظاہرِ نماز سے آشنا ہو اس کی نماز کچھ اور ہوتی ہے اور جو باطنِ نماز سے آشنا ہو اس کی نماز کچھ اور ہوتی ہے، حقیقتاً اس کی نماز مؤمن کی معراج ہے ورنہ ظاہر میں تو کربلا میں فاسقین و قاتلین بھی نماز پڑھتے تھے۔

اسی طرح اس قیامِ مقدس کے کچھ آثار ہیں، اگر وہ ہماری زندگی میں ظاہر ہوئے تو پھر یہ قیامِ مقدس ہمیں سستی و ذلت اور منکر و فحشاء سے بچاتا ہوا نظر آئے گا کیونکہ یہ قیام بھی فحشاء اور منکرات کے خلاف تھا، اگر ہمارے معاشرے میں فحشاء اور منکرات کا رواج نہ ہو، قتل و غارت اور ظلم و ستم کا وجود نہ رہے، دین کی نسبت بے حسی اور بے پروائی نہ ہو، ہر جگہ عدل و انصاف حاکم ہو، جہاں بھی کوئی ظلم ہوتا ہے تو اس کو فوراً جواب ملتا ہو تو پھر ہم سمجھیں گے کہ اس قیامِ مقدس کے آثار ہم پر مترتب ہو رہے ہیں۔

اسی طرح اور بھی بہت سے اثرات ہیں اگر یہ اثرات پائے جاتے ہوں تو گویا ہم حقیقتِ کربلا سے آشنا ہیں ورنہ ظاہرِ کربلا سے آشنائی حاصل کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا اور حقیقتِ کربلا تک پہنچنا اس وقت ممکن ہے کہ جب ہم کربلا کی صحیح تفسیر کرسکیں۔ واقعہ کربلا کی صحیح تفسیر کرنا اور اس قیامِ مقدس کے متعلق

صحیح نظریہ اپنانے پر کچھ اثرات بھی مترتب ہوتے ہیں۔

واقعۂ کربلا کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ جو ہمیں سکوت اور خاموشی کی زندگی سے نکال کر متلاطم اور پُرتحرّک زندگی کی طرف لے آتا ہے، حق طلبی اور حق کو محور قرار دینا کربلا کے اثرات میں سے ایک اثر ہے۔ آثارِ کربلا سے متاثر ہو کر انسان منزلِ شہادت کی طرف بڑھتا ہے۔ شہداء وہ لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں اپنا خون بہا چکے ہیں، انہوں نے کربلا کی صحیح تفسیر پڑھ لی تھی لیکن کس حس سے یہ تفسیر پڑھی یہ الگ بات ہے لیکن واقعاً انہوں نے کربلا کی صحیح تفسیر کی تھی اسی لیے تو وہاں تک جا پہنچے کہ جہاں تک عاشورا نے ان کو پہنچانا تھا۔ یہ عاشورا کے اثرات جو ہماری زندگیوں پر پڑتے ہیں، کچھ میری زندگی پر، کچھ آپ کی زندگی پر، کچھ کسی اور کی زندگی پر یہ درحقیقت اسی صحیح تفسیر کا نتیجہ ہیں۔ دوسری طرف یہ شہداء ہیں، انہوں نے بھی کربلا کی تفسیر کر کے اثراتِ عاشورا کو اپنایا ہے۔ واقعاً یہ شہداء ایسے انسان تھے کہ جن کی زندگی میں عاشور کے اثرات نظر آتے تھے، آخر کار اپنا خون پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ کس قدر ان آثار سے اور راہِ شہداءِ کربلا سے متاثر ہیں۔ انسان عاشورا کی اس طرح تفسیر کرے کہ عاشورا والوں کے ساتھ محشور ہو جائے۔

صحیح تفسیر کا معیار یہ ہے کہ ایک تو مفسر کو متعلقہ واقعہ پر احاطہ ہو، تاریخی پہلو سے واقعہ کی جزئیات سے آگاہی رکھتا ہو۔ تاریخی سندوں اور اقوال کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، مورخ یا تاریخ نگار اور مفسر تاریخ میں فرق ہے لہٰذا بعض شرائط تاریخ نگار کیلئے ضروری نہیں ہیں لیکن تاریخ کی تفسیر کرنے والے کے لیے ضروری ہیں، جیسے راویٔ قرآن اور مفسر قرآن میں فرق ہے۔ مفسر تاریخ کے لیے فلسفۂ تاریخ سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ فلسفۂ تاریخ دراصل تاریخ کو سمجھنے کی منطق کا نام ہے۔ ایک دقیق و

عمیق فلسفۂ تاریخ ہی مفسر کو صحیح تفسیر کا معیار فراہم کرسکتا ہے۔ چونکہ تاریخ کے ظاہر کے علاوہ کچھ ایسے اصول ہیں جو تاریخ کے پسِ منظر میں کارفرما ہوتے ہیں، وہ اصول ماضی کو حال اور مستقبل سے متصل کرتے ہیں۔ راوی یا مورخ کا کام فقط حالات و واقعات سے آگاہ کرنا ہے جبکہ مفسر تاریخ کا فریضہ تاریخ سے نتیجہ لینا ہے۔

درست تفسیر کے لیے ضروری ہے کہ نتیجہ لیتے وقت ہر روایت یا قول سے نتیجہ نہ لے بلکہ تمام روایات و اقوال کو ملاحظہ کرے اور ان کی نوعیت و اقسام کو تشخیص دے، ان سے الگ الگ اور باہم مراد سمجھنے کے بعد نتیجہ لے۔ کسی متن یا روایت کے معنیٰ کرنے اور نتیجہ لینے میں فرق ہے۔ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام نے روایت و درایت میں اسی لیے فرق بیان کیا ہے کہ اہلِ روایت کی کثرت ہے لیکن اہلِ درایت کم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبۃ الوداع میں جو خطبہ غدیر کے نام سے مشہور ہے فرمایا کہ

رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ..... [1]

بہت سے فقہ بتانے والے اس کو بتاتے ہیں جو ان سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے.....

یعنی حاملِ تاریخ ممکن ہے تاریخ کو اس طرح سے درک نہ کرتے ہوں کہ جس طرح وہ افراد درک کرسکتے ہیں جن تک تاریخ پہنچتی ہے۔ فقط ایک روایت یا تاریخی قول سے نتیجہ لینا بجائے خود فہم میں تضاد و تناقض کا باعث ہے۔ ہر قول یا روایت کا معنیٰ کرکے پھر اسے دیگر اقوال و روایات و قرائن کے

---

[1]..... (تسنیم تفسیر قرآن کریم- آیۃ اللہ جوادی آملی مدظلہ) (مرآۃ العقول فی شرح أخبار آل الرسولؐ- العلامۃ المجلسیؒ، الجزء۱، صفحہ۱۵۱) (مستدرک سفینۃ البحار- العلامۃ آیۃ اللہ الشیخ علی النمازی، الجزء۲، صفحہ۲۳۳)

ساتھ ملا کر اصلی نتیجہ دریافت کرنا تفسیر کا صحیح فن ہے۔ مفسّر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جس واقعہ یا متن کی تفسیر کے درپے ہے اس کی ماہیت و نوعیت کو پہلے تشخص دے اور پھر اس واقعہ کی تفسیر کرے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ بعض اقوال یا روایات کا مضمون یا ان سے حاصل کیا گیا نتیجہ واقعہ کی ماہیت اور نوعیت کے ساتھ تضاد رکھتا ہو۔ اس کی مثال شہید مطہریؒ نے بیان کی ہے کہ ایک معروف قول امام حسین علیہ السلام سے منسوب ہے کہ

انما الحیاۃ عقیدۃ و جهاد......[1]

یعنی زندگی عقیدہ و جہاد یا عقیدہ کی راہ میں جہاد کا نام ہے۔

شہید مطہریؒ فرماتے ہیں کہ یہ قول ماہیت و نوعیتِ واقعۂ کربلا کے خلاف ہے کیونکہ کربلا حق کی راہ میں جہاد کا نام ہے یا کربلا کی ماہیت حق کی راہ میں جہاد سے عبارت ہے نہ کہ عقیدۂ محض کی راہ میں، کیونکہ کیمونزم کا نعرہ بھی یہی ہے کہ انسان اپنے نظریہ وعقیدہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے بلکہ کیمونزم کی تھیوری (Theory of Communism) کے مطابق فقط ایک حالت میں جنگ کا جواز ہے کہ جب وہ جنگ عقیدہ و نظریہ کی راہ میں ہو۔ لہٰذا حق کی راہ میں جنگ اور عقیدہ و نظریہ کی راہ میں جنگ دو الگ الگ جنگیں ہیں۔ لہٰذا یہ قول چونکہ ماہیتِ کربلا سے ٹکراتا ہے اس لئے شہید مطہریؒ نے اسے امام کے قول کے طور پر قبول نہیں کیا۔ راوی کے لیے یہ مہم نہیں ہے کہ یہ ماہیتِ کربلا کے ساتھ سازگار ہے یا نہیں ہے بلکہ اسے فقط قول نقل کرنا ہے۔

---

[1]......(موسوعہ روائع الحکمۃ والاقوال الخالدہ، صفحہ ۲۶۲) (فی رحاب ولید الکعبۃ)

چوتھا نکتہ ⇦ صحیح تفسیر کے ضوابط

جیسا کہ قرآنِ کریم کی تفسیر کرنے کے کچھ ضوابط ہیں، ہر مفسّر کو ان ضوابط کی رعایت کرنی پڑتی ہے ورنہ ان ضوابط کو مدنظر رکھے بغیر اگر کوئی قرآنِ کریم کی تفسیر کرے تو یقیناً وہ تفسیر غلط ہے مثلاً قرآنِ کریم کی تفسیر کرتے ہوئے اپنی شخصی رائے کو اس میں داخل نہیں کر سکتے یعنی انسان کی ذاتی رائے (کہ جو گمان پر مبنی ہو، جو زعم اور ظن کی حد تک ہو) کے مطابق کوئی قرآن کی تفسیر نہیں کر سکتا ہے اس لیے کہ شخصی ظن و گمان انسان کو حق تک نہیں پہنچا سکتا بلکہ شخصی ظن و گمان پر عمل کرنا نہایت مذموم بھی ہے۔

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا..... [1]

گمان یقین کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہیں آ سکتا.....

جو تفسیر ذاتی رائے پر مبنی ہو اس کو تفسیر بالرائے کہتے ہیں اور روایات میں تفسیر بالرائے کرنے سے سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَأْیِہٖ فَقَدْ کَفَرَ..... [2]

یعنی جو اپنی رائے کے مطابق قرآن کی تفسیر کرے وہ کافر ہے۔

---

[1]..... سورۂ یونس، آیہ ۳۶ [2]..... (دور اہل البیتؑ فی بناء الجماعۃ الصالحۃ، جلد ۲، صفحہ ۳۹۷)

(مناہل العرفان فی علوم القرآن، جلد ۲، صفحہ ۸۷) (آشنایی با تفسیر علمی قرآن)

حدیثِ قدسی: مَا اٰمَنَ بِیْ مَنْ فَسَّرَ بِرَأْیِہٖ کَلَامِیْ..... ''جو اپنی رائے سے میرے کلام کی تفسیر کرے وہ مجھ پر ایمان ہی نہیں لایا ہے۔'' (المناہج التفسیریۃ فی علوم القرآن) (تسنیم تفسیر قرآن کریم- آیۃ اللہ جوادی آملی مدظلہ)

اسی طرح واقعۂ کربلا بھی بہت بڑی آیتِ الٰہی ہے اور اس کی تفسیر کے لیے بھی کچھ ضوابط اور اصول ہیں۔ ان جملہ ضوابط میں سے ایک ضابطہ یہ ہے کہ مفسر کے لیے ہر اصول مسلّم اور طے شدہ ہو یعنی اس کا پکّا عقیدہ ہو کہ یہ قیامِ مقدس ایک موفق، ظفر مند اور کامیاب قیام تھا، یہ قیام شکست خوردہ نہیں تھا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے بلکہ آپ نے ظلم و ستم کا سامنا کر کے مقابل کو شکست سے دوچار کیا اور خود اپنے مقصد میں سو فیصد کامیاب ہوئے۔ اس جنگ میں امام حسین علیہ السلام فاتح ہوئے اور یزیدیت کو بُری طرح سے شکست ہوئی۔ ورنہ جس انسان کا یہ عقیدہ ہو کہ یہ قیام کامیاب قیام نہیں تھا اور امام حسین علیہ السلام اپنے مقصد میں ناکام رہے ہیں تو وہ جو بھی تفسیر کرے گا وہ صحیح تفسیر نہیں ہوگی۔

لہٰذا صحیح تفسیر کی بنا و بنیاد یہ ہے کہ یہ ایک کامیاب قیام تھا۔ اس ضابطہ کے تحت اگر ہم گزشتہ بہت سی تفاسیر پر نگاہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ غلط تفاسیر ہیں جو اس ضابطہ سے ہٹ کر کی گئی ہیں۔ اس لیے کہ ان تفاسیر کے مطابق یہ قیام کامیاب قیام نظر نہیں آتا، کیونکہ اگر یہ جنگ اقتدار کے حصول کے لیے تھی تو اقتدار تو نہیں ملا، اگر حکومت تشکیل دینے کے لیے تھی تو حکومت تشکیل نہیں دے سکے، اگر فقط خلافت کو ملوکیت سے بچانا مقصد ہوتا تو خلافت تو ملوکیت میں ہی بدلی اور آخر تک ملوکیت طرز کی حکومتیں آتی رہیں، اگر طبقاتی جنگ ہوتی تو اس میں بنی امیہ کامیاب نظر آ رہے ہیں، اسی طرح دوسری تفاسیر بھی ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام تفاسیر جو اس ضابطہ سے ہٹ کر کی گئی ہیں قابلِ قبول نہیں ہیں۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق ایسی تفسیر کریں کہ جس میں اس قیامِ مقدس کی کامیابی صاف نظر آئے، جس میں یزید اور یزیدیت شکست خوردہ نظر آئے۔

پانچویں فصل:

امام حسین علیہ السلام کا

جامع المقاصد قیام

جامع المقاصد قیام

درحقیقت سید الشہداء علیہ السلام کا قیام جامع المقاصد تھا۔ جامع المقاصد سے مراد یہ ہے کہ اس قیام کے مختلف اور گوناگوں مقاصد تھے جو سب کے سب حاصل بھی ہوئے ہیں، اس لیے اس پورے قیام اور ان تمام مقاصد کا ایک نکتۂ اشتراک بھی ہے اور وہ یہ کہ امام حسین علیہ السلام نے حق کو محور قرار دیا، حق پرستی اور اقدارِ حق کو زندہ کیا، ان تمام مقاصد کا محور حق پرستی ہے۔

البتہ اس تفسیر کو بیان کرنے سے پہلے یہ نکتہ بیان کرنا نہایت ضروری ہے کہ یہ توقع ہرگز نہ رکھیں کہ ہم یہاں پر سیر حاصل بحث کریں گے اور اس موضوع کا پورا پورا حق ادا کریں گے۔ اس لیے کہ کوئی چند جملوں کو جاننے کی وجہ سے اپنے عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اگرچہ اس زمانے میں تو توقعات یہاں تک ہیں کہ سارا کا سارا علم ہاں یا نہ میں سمیٹنے کی کوشش کی جائے، خصوصاً اس راقم جیسے کم علم اور کم اطلاع انسان سے یہ توقع ہرگز نہ رکھیں، ہماری صرف یہ کوشش ہوتی ہے کہ موضوع چھیڑا جائے اور اس کا صرف آغاز ہو جائے۔ ہمارے ہاں نہ صرف یہ کہ موضوعات کے متعلق سیر حاصل گفتگو نہیں ہوتی بلکہ بہت سارے موضوعات کا ہمارے درمیان آغاز ہوتا ہی نہیں، ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ کم از کم یہ موضوعات کھل جائیں تاکہ بحث و گفتگو کے لیے میدان فراہم ہو سکے۔ جب کسی موضوع کے متعلق بحث چھڑ جائے تو پھر اہلِ تحقیق خود ہی اس کو نتیجہ تک پہنچا دیں گے۔

معارف کی تشنگی پیدا کریں

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم جب کسی موضوع پر بحث شروع کرتے ہیں تو بعض حضرات اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ موضوع تشنہ رہ گیا ہے، مجھے بھی ایسے اظہارِ نظر سے خوشی محسوس ہوتی ہے لہٰذا کبھی ان کو جواب دیتا ہوں کہ میری غرض بھی یہ ہے کہ آپ کی تشنگی کو ابھارا جائے تا کہ آپ یہ موضوعات سیکھنے کے لیے مزید تشنہ تر نظر آئیں، مقصد آپ کی تشنگی بجھانا نہیں ہے۔ میں یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ خدا ہمیں ان موضوعات کے متعلق اور بھی تشنہ تر کر دے اور وہ دن نہ آئے کہ احساس کریں کہ اب ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، اب ہماری پیاس بجھ چکی ہے۔ ہمارا کام پیاس بجھانا نہیں بلکہ پیاس بڑھانا ہے۔ بعض اوقات انسان احساس نہیں کرتا کہ بھوک یا پیاس لگی ہوئی ہے اور جب یہ احساس ختم ہو جائے تو گھر والے پریشان ہوتے ہیں کہ ہمارے اس مریض کو کیا ہوا لہٰذا اس کو ہسپتال لے جاتے ہیں تا کہ اس کو بھوک لگے۔ اسی طرح علم و معرفت کے میدان میں جس دن ہماری یہ حالت ہو جائے تو فوراً طبیب کے پاس جانا چاہیے تا کہ وہ ہمارا علاج کرے اور ہمیں علمی بھوک اور پیاس لگنا شروع ہو جائے، اس طرح نہ ہو کہ دو جملے سننے سے احساسِ علمیت پیدا ہو بلکہ اور بھی مزید آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عظیم مرتبۂ علمی پر فائز ہونے کے بعد بھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰی ۝[1]

---

[1]..... سورۂ اعلیٰ، آیہ ۶

ہم تمہیں (ایسا) پڑھادیں گے کہ کبھی بھولو ہی نہیں۔

پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ۱

پروردگارا! میرے علم میں اضافہ فرما۔

یا یہ جملہ کہ

رَبِّ زِدْنِیْ تَحَیُّراً..... ۲

یعنی اے رب! میری حیرت وجستجو میں اضافہ فرما۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اللہ تعالیٰ سے یہی دعا مانگتے ہیں تو ہماری کیا حالت ہونی چاہیے جبکہ ہم نے تو الف ب تک نہیں پڑھی، ہمارے بارے میں ہے کہ

وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۳

اور تمہیں تو بہت کم علم دیا گیا ہے۔

اگر دو چار نکات ہم نے سیکھ لیے تو اس کو علم نہیں کہتے لہٰذا انسان احساسِ تشنگی کو ختم نہ کرے بلکہ اس کو بڑھانے کی کوشش کرے۔ بہر حال کربلا جیسے موضوعات نہایت بحث طلب ہیں، سالہا سال تک اگر ان پر بحث وگفتگو کی جائے تو پھر بھی یہ موضوعات تشنہ ہیں بلکہ قرآنِ کریم کے متعلق تو یہ ہے کہ جب حشر میں یہ کتاب محشور ہوگی تو ایسی ہوگی جیسے ابھی تک کسی نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا یعنی قرآن حشر

۱..... سورۂ طٰہٰ، آیہ ۱۱۴ ۲..... شرح نہج البلاغہ - جعفری ۳..... سورۂ اسراء، آیہ ۸۵

میں بکر (غیر استعمال شدہ)(Untouched) ہوگا، اتنی ساری تفاسیر کے باوجود پھر بھی بکر کا بکر ہی ہوگا۔ واقعۂ کربلا بھی ایسا ہی ہے کہ کل حشر میں معلوم ہو جائے گا یہ واقعہ ابھی تک بکر ہے گویا کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ یہ اتنا بڑا سمندر ہے کہ گویا ابھی تک کسی نے اس سے پیا تک نہیں کیونکہ پیاس بہت ہی کم ہے۔ سمندر اور دریا سے چند چلو یا معمولی مقدار میں پانی لینے سے اس پر کیا اثر پڑتا ہے!

حضرت امام حسین علیہ السلام، واقعۂ کربلا کے بہترین مفسر

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس واقعہ کے بہترین مفسر خود سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ اس ذاتِ گرامی میں وہ ساری لازمی شرائط پائی جاتی ہیں، وہ دشواریاں اور رکاوٹیں جو تفسیر کی راہ میں پائی جاتی ہیں یہاں پر موجود نہیں ہیں۔ یہاں قوتِ تخیل کی مزاحمت نہیں ہے کیونکہ امام حسین علیہ السلام معصوم ہستی ہیں، معصوم جس طرح مقامِ عمل میں معصوم ہوتا ہے اسی طرح مقامِ فکر میں بھی معصوم ہوتا ہے۔ قوتِ تخیل معصوم کے لیے کوئی مزاحمت ایجاد نہیں کرتی، اس طرح جتنا منظر کربلا وسیع ہے اس سے کہیں زیادہ نظر امام حسین علیہ السلام وسیع ہے۔ کیونکہ کربلا کی تخلیق امام حسین علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوئی لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے اس واقعہ کی تفسیر سب سے پہلے خود کی ہے یعنی واقعہ کے وقوع سے پہلے اس کی تفسیر کر کے گئے اور اس کام کو بھی دوسروں کے ذمہ نہیں چھوڑا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے آغاز میں ہی بتا دیا کہ میں یہ کام کیوں کر رہا ہوں اور بعد میں مختلف مراحل میں اس پر تاکید کرتے رہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی تفسیر کو سمجھیں، اس کی تشریح کریں اور اس کو بیان و عیاں کریں۔ ہم اس تفسیر کو چند ایک عناوین سے تمسک کر کے بیان کر

سکتے ہیں مثلاً انبیاءؑ کا وارث ہونا، عنوانِ امامت وامت اور امام حسین علیہ السلام کا اسوہ وغیرہ وہ کلیدی عناوین ہیں کہ جن میں جھانک کر دیکھنے سے اس منظر کو دیکھا جا سکتا ہے۔اب ہم ذیل میں ان عناوین کی مزید وضاحت کر کے فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

الف: وراثت انبیاءؑ کے تقاضے

وراثت انبیاءؑ کے تقاضے

امام حسین علیہ السلام نے یہ قیام کیوں کیا؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کے محرکات اور عوامل کیا تھے؟ اس سوال کا جواب یہ مختصر سا جملہ ہے کہ اس لیے یہ قیام فرمایا کیونکہ آپؑ انبیاءؑ کے وارث ہیں۔آپؑ نے وراثت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے یہ عظیم قیام کیا۔انبیاءؑ کو ان کی زندگی میں ایک بہت بڑی مشکل درپیش تھی، یہ ایسی مشکل ہے جو تمام معصومینؑ، اولیاء، صلحاء، اہلِ حق اور علماء کو درپیش رہی ہے اور ابھی بھی یہی مشکل موجود ہے۔خداوند نے جب کسی نبی یا پیغمبر کو مبعوث کیا تو وہ بھی اس مشکل سے دوچار رہا ہے اور ہر ایک نے اپنے تئیں اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔حضرت امام حسین علیہ السلام نے اسی مشکل کے حل کے لیے یہ اقدام کیا، بالآخر آپؑ سے یہ مشکل حل ہوئی۔فلسفۂ قیامِ مقدس اسی مشکل کے حل میں مضمر ہے، درحقیقت اس قیام کے ذریعے سے وہ بنیادی مشکل حل ہوئی جو ہمیشہ سے انبیاءؑ کو درپیش رہی تھی اس لیے کہ آپؑ وارثِ انبیاءؑ ہیں، انبیاءؑ کی مشکلات کا حل کرنا وارث کا کام ہوتا ہے۔ہم زیارتِ وارثہ میں امام حسین علیہ السلام کے لیے پڑھتے ہیں کہ

السلام علیک یا وارث آدم صفوۃ اللّٰہ، السلام علیک یا

وارث نوحٍ نبی اللّٰہ.....

پس واقعۂ کربلا درحقیقت ترکۂ انبیاءؑ تھا لہٰذا امام حسین علیہ السلام وارثِ انبیاءؑ قرار پائے، یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام اپنے ماقبل سے بھی مربوط تھے کیونکہ وارث تھے، وراثت انبیاءؑ کے ساتھ ارتباط ہے بلکہ ایک تسلسل ہے۔ اسی طرح آپ علیہ السلام مابعد سے بھی مربوط ہیں اس لیے کہ امام حسین علیہ السلام اسوہ ہیں، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

لَكُمْ فِيَّ اُسْوَةٌ..... [1]

یعنی میری ذات تمہارے لیے نمونہ ہے۔

اب اس بارے میں دیگر معصومین علیہم السلام کے فرامین کو بھی مدنظر رکھیں جیسے:

اِنَّ الْحُسَيْنَ مِصْباحُ الْهُدى وَسَفينَةُ النَّجاةِ..... [2]

بے شک حسین نجات کی کشتی اور ہدایت کا چراغ ہیں۔

یہ دو قول درحقیقت امام حسین علیہ السلام کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو سے اپنے اسلاف اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مربوط ہیں اور ایک پہلو سے بعد والی امتوں، اقوام اور ملل کے ساتھ مربوط ہیں یعنی ماقبل کے وارث ہیں اور اپنے مابعد کے لیے اسوہ ہیں۔ ساری حقیقت اور سارے رمز و راز ان ہی دو لفظوں یعنی وارث اور اسوہ سے نکالے جا سکتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس العیاذ باللہ امام حسین علیہ السلام کا کوئی کلام نہ بھی ہوتا تو بھی ہمیں تفسیر کربلا کے لیے یہی دو عناوین ہی کافی تھے کہ امام حسین علیہ السلام وارث بھی ہیں اور اسوہ بھی۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان دو عناوین کی تفسیر کریں اور اس سے پردہ اٹھائیں اس لیے کہ تفسیر

---

[1]..... (مقتل المقدم، صفحہ ۱۸۴) (فتوح، جلد ۵، صفحہ ۹۱) (کامل، جلد ۲، صفحہ ۵۵۳)

[2]..... اسرار عاشورا، جلد ۴، صفحہ ۲۰

کے معنیٰ بھی پردہ اٹھانے کے ہیں، لغت میں تفسیر کا لفظ ''کشف القناع'' کے معنیٰ میں آیا ہے یعنی کسی چیز سے پردہ اٹھانا، چونکہ قرآن کریم کے معانی پر الفاظ کے پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں لہٰذا مفسران پردوں کو ہٹا دیتا ہے، الفاظ کے پردوں کو ہٹا کر روحِ معانی اور اصل معانی نظر آنے لگتے ہیں اور اس کو تفسیر قرآن کہا جاتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام وارثِ انبیاءؑ ہیں، انہوں نے بہت سی چیزیں ارث میں پائی ہیں، آپؑ نے انبیاء علیہم السلام کو درپیش بنیادی مشکلات بھی ارث میں پائیں اور اس کے حل کے لیے یہ عظیم قربانی پیش کی۔

قرآنِ کریم نے انبیاء علیہم السلام کو درپیش مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے نبی نوح علیہ السلام ہیں کہ جن کی مشکلات کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو درپیش مشکلات، ان کی تبلیغ اور ان کے اہداف و مقاصد کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے، بالخصوص ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشکلات کا تذکرہ قرآن نے بہت اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان مشکلات میں سے بعض بنیادی حیثیت کی مشکلات تھیں جو تمام انبیاء علیہم السلام کو درپیش رہی ہیں۔ ان جملہ بنیادی مشکلات میں سے کہ جس کی وجہ سے لوگ ضلالت و گمراہی میں سرگرداں ہو کر ہدایت سے محروم ہو گئے اور جس کی وجہ سے راہِ ہدایت میں خلل پیدا ہوا وہ لوگوں کی پہچاننے میں بے حسی تھی، حق کی بابت بے حسی سب سے بڑی اور بنیادی مشکل ہے۔

بنیادی مشکل کی وضاحت

حق کا دائرہ بہت وسیع ہے، امیر المومنین علیہ السلام کے فرمان کے مطابق حق بیان کرنے میں بہت

وسیع ہے اور عمل کرنے میں اس کا دائرہ تنگ ہے،یعنی بات کریں،وضاحت کریں اور لیکچر (Lecture) دیں تو حق ہی بیان کریں گے لیکن عمل کے مرحلہ میں حق کا دائرہ بہت تنگ ہے۔

مولا علی علیہ السلام نہج البلاغہ، خطبہ ۲۱۴ میں فرماتے ہیں کہ

فَالْحَقُّ أَوْسَعُ الْأَشْيَاءِ فِي التَّوَاصُفِ وَاَضْيَقُهَا فِي التَّنَاصُفِ.....

ترجمہ: یوں تو حق کے بارے میں باہمی اوصاف گنوانے میں بہت وسعت ہے لیکن آپس میں حق وانصاف کرنے کا دائرہ بہت تنگ ہے.....

ہر قدم حق کا قدم نہیں ہوتا۔حق بھی مطلق ہے، ذاتِ خدا سے لے کر ایک معمولی سا انسانی اور بشری حق بھی اس میں شامل ہے۔ بے حسی سے مراد وہی ہے جس کو ہم بے ہوشی، مدہوشی اور اغماء کہتے ہیں مثلاً اگر کوئی مریض ہو جائے اور اس کا آپریشن کرنا ہو تو اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس کے بدن کا حصہ کاٹا جائے گا اور اس کاٹے جانے کا شدید درد ہوتا ہے لہٰذا اس درد کی ٹیسوں اور احساس سے بچانے کے لیے اس کے بدن کو بے حس کر دیا جاتا ہے، اسے مدہوش اور بے ہوش کیا جاتا ہے تاکہ درد کو محسوس نہ کرے۔ جب درد محسوس نہیں ہوتا تو پھر جو مرضی ہے اس بدن کے ساتھ کرو، اس کو چیرو، پھاڑو، اس کو گرمی یا سردی میں پھینک دو لیکن اس کو کچھ بھی احساس نہیں ہوگا، یعنی جس چیز کی نسبت انسان کو بے حس کر دیا جائے تو اس چیز کا ہونا یا نہ ہونا اس کے لیے برابر ہوتا ہے۔ البتہ یہ صرف احساس کے مرحلہ میں ہوتا ہے ورنہ ایسا نہیں کہ واقعاً وہ چیز نہیں ہوتی۔ جب آپریشن ہو رہا ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ واقعاً درد نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ جب تک یہ بے ہوش اور مدہوش ہے اس کو درد کا احساس نہیں ہوتا لیکن جوں ہی بے حسی ختم ہو جائے تو فوراً درد کا احساس شروع ہو جاتا ہے۔ درد جہاں

اپنے اندر شدت رکھتا ہے وہاں فائدہ مند بھی ہے۔ کہتے ہیں وہ مرض کہ جس میں مریض کو درد کا احساس نہ ہو یا بہت دیر سے درد کا احساس ہو تو وہ مرض مہلک ہوتا ہے۔ لہٰذا جس میں درد کا احساس مرجائے، جس میں درد محسوس نہ ہو، جو اہلِ درد نہ ہو اس کی ہلاکت عنقریب واقع ہونے والی ہے۔

جو کسی چیز کا درد محسوس نہ کرے اور سب سے بڑھ کر اس کے اندر حق کا درد نہ ہو تو وہ جلد ہی ہلاک ہونے والا ہے۔ بے درد لوگ، بے درد دنیا ادیبوں کی عام اصطلاح ہے، بدن کا درد تو ہر ایک محسوس کرتا ہے حتیٰ کہ سوئی کے چبھنے سے بھی درد کا احساس ہوتا ہے لیکن یہی آدمی کہ جو جسمانی درد کا شدت سے احساس کرتا ہے جب ہر سُو اس کو درمند چہرے نظر آتے ہیں، اس کو ننگے تن، بھوکے پیٹ اور بیماریوں سے پچکے ہوئے گال نظر آتے ہیں تو یہ ان کے قریب سے خوش ہو کر ایسے زناٹے سے گزر جاتا ہے کہ گویا اس نے دیکھا ہی نہیں۔ سوئی چبھنے سے تو ہمیں درد ہوتا ہے، یہ ہمارا جسمانی درد ہے لیکن ہمارا دل مدہوش ہے، ہمارے دل میں کسی کا درد نہیں، کتنی دفعہ ہم بے اعتناء، لاپروا اور بے حس ہو کر ان مناظر کے قریب سے گزر جاتے ہیں لیکن سوئی چبھنے کے برابر درد کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کتنی خبریں، حوادث اور واقعات ہیں کہ جن کی اطلاع ملتی ہے تو ہمیں درد محسوس ہوتا ہے؟

اگر بے حسی کو دیکھنا ہے تو بہت دور جانے کی ضرورت نہیں کہ ہم دیکھیں بے حس انسان کیسے ہوتے ہیں؟ بے حس انسان دیکھنے کے لیے تجربہ گاہ ہمارے پاس ہی موجود ہے، اپنے اندر ہی دیکھ لیں کہ آیا درد موجود ہے یا نہیں؟ جب انسان کو درد محسوس نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ سبب جس نے یہ درد پیدا کیا ہے اس کا بھی اسے احساس نہیں ہوتا۔ انسان اتنا بے حس ہو جائے کہ حق کا درد اس میں مٹ جائے، حق کے دردناک مناظر دیکھے اور اس میں درد محسوس نہ ہو تو اس صورت میں یہ بے حسی تمام مشکلات کی جڑ

ہے۔آج کل ایک سرجیکل ٹیکنالوجی (Surgical Technology) ہے کہ جس میں آپریشن کے لیے سرجن (Surgeon) کو تعلیم دی جاتی ہے کہ آپ نے سرجری (Surgery) کیسے کرنی ہے اور اس کے ساتھ ایک ٹیکنیشن (Technicion) ہوتا ہے جس کو یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ نے بے ہوش کیسے کرنا ہے۔لہٰذا بے ہوش کرنے کے لیے خاص ماہرین ہوتے ہیں کہ جن کا کام صرف بے ہوش کرنا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ قوموں اور ملتوں کو بے حس اور مدہوش بنانے کے بڑے ماہر ہوتے ہیں،ان کو بے ہوش کرنے کے ماہر بڑی مہارت کے ساتھ مدہوش کر دیتے ہیں۔پہلے یہ لوگ آ کر امتوں کو بے حس اور مدہوش کرتے ہیں پھر دوسرا طبقۂ ظالمین آتا ہے جو جراح بن کر ان کا آپریشن کرتا ہے اور انہیں چیر پھاڑ کر کھا جاتا ہے لہٰذا ان جراحوں سے پہلے یہ بے ہوش کرنے والے ماہرین آتے ہیں اور ان معاشروں کو زبان،منبر،قلم،تقریر اور میڈیا (Media) یعنی ہر ممکن وسیلہ سے بے حس کر دیتے ہیں تا کہ جب یہ ظالم حکمران اور جراح آئیں اور تمہارا پیٹ اور سینہ چاک کریں،تمہارے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور ملت کو احساس تک نہ ہو کہ قوم کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔یہ بے ہوش کرنے والے ایسے ماہر ہوتے ہیں کہ جب امتوں کو بے ہوش کرتے ہیں تو ان کی بے ہوشی کسی معمولی چیز سے نہیں اترتی بلکہ ملت گہری نیند سو جاتی ہے لہٰذا پھر ان کو اس چیر پھاڑ اور درندگی کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ ملت کو احساس ہوتا ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں اور عنقریب پہلی دنیا کے ممبر بننے والے ہیں۔

یہ بات مشاہدے میں آتی ہے کہ کبھی بے ہوش انسان ہذیان بکتے ہیں،اگر بے حسی کے عالم میں کوئی بول رہا ہو یا لکھ رہا ہو تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ واقعاً تقریر کر رہا ہے بلکہ ایسا شخص ہذیان بک رہا

ہوتا ہے۔ بے حسی کے عالم میں جو کچھ کہا جائے وہ ہذیان ہوتا ہے، بے حس قومیں ہذیان زیادہ بکتی ہیں جبکہ بیدار قومیں عمل زیادہ کرتی ہیں۔ بے حسی جتنی گہری ہوتی ہے ہذیان بکنا اتنا زیادہ ہو جاتا ہے لہٰذا ہذیان بکنا حیات کی دلیل نہیں بلکہ بے حسی کی علامت ہے۔ جب میڈیا پر ہذیان بکا جا رہا ہو، منبروں پر ہذیان ہو، مسجدوں میں ہذیان ہو، کتابوں اور لیکچروں میں ہذیان ہو، تعلیمی مراکز میں ہذیان ہو تو یہ معاشرے کی بے حسی کی علامتیں ہیں۔ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ جب کسی سخت مشکل میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو اپنے آپ کو بے حس کر لیتے ہیں، کوئی نشہ آور چیز کھا لیتے ہیں تا کہ کچھ مدت کے لیے بے حس ہو جائیں تا کہ اس درد و مشکل سے غافل ہو جائیں لیکن بے حسوں کے درد بے حسی سے ختم نہیں ہوتے بلکہ اس قسم کی بے حسی سب سے بڑی آفت ہوتی ہے۔

بے حسی کا سرچشمہ

ایسا نہیں ہوتا کہ قوموں میں اچانک ہی بے حسی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یہ سفر بہت دور سے شروع ہوتا ہے اس لیے کہ خداوند تعالیٰ نے ہر انسان کو حساس بنا کر پیدا کیا ہے لہٰذا بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کا پہلا کام رونا ہے۔ اگر بچہ نہ روئے تو والدین کوشش کرتے ہیں کہ یہ روئے یعنی ہر گریہ انسان کو ناپسند ہے سوائے اس رونے کے کہ اس رونے پر ہم خوش ہوتے ہیں، جب وہ روتا ہے تو ہم ہنستے ہیں اور جشن مناتے ہیں، بچے کے رونے سے والدین کے دل میں سرور پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس رونے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کے اندر احساسِ حیات موجود ہے، اس کے اندر رمقِ زندگی پائی جاتی ہے، یہ گریہ احساس کی غمازی کرتا ہے یعنی یہ گریہ بتاتا ہے کہ یہ بچہ احساس رکھتا ہے۔ اگر پیدا ہوتے ہی بچہ نہ روئے تو معلوم

ہوتا ہے کہ یہ بے حس ہے اور بے حس بچہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا ہے لہٰذا بے حسی انسان کو موت کے کنارے لے جاتی ہے۔ اسی وجہ سے والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ بچہ کسی نہ کسی طریقے سے روئے اور اگر نہیں روتا تو اس کو رلاتے ہیں تا کہ اس کی بے حسی ختم کر دی جائے۔ پس ہر رونا بدعت نہیں، ہر رونا قبیح بھی نہیں بلکہ بعض رونے ایسے ہیں جو انسان کے احساس کی غمازی کرتے ہیں، بعض گریے بتاتے ہیں کہ یہ زندہ انسان ہے اور اس کے اندر حیات ہے۔ اگر نہ روئے تو اس کو رُلاؤ حتیٰ اگر روتا بھی نہیں تو رونے والوں کی شکل بنالو تا کہ پتہ چلے کہ یہ ابھی مرے گا نہیں، یہ ابھی مردہ لاش نہیں ہے، اس کے اندر کچھ نہ کچھ رمقِ حیات موجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر انسان فطری طور پر حساس پیدا ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر یہ بے حسی کہاں سے آ گئی ہے؟ بے حسی کا آغاز اور سر چشمہ بے اعتنائی ہے یعنی لاپروائی کرنا اور کسی چیز کی طرف توجہ نہ دینا، یہ بے حسی کی طرف پہلا قدم ہے، لاپروائی کا نتیجہ بے حسی ہے مثلاً ایک فقیر کو دیکھا اور اس کی طرف توجہ نہیں کی، دوسرے دن دوسرے فقیر کو دیکھا پھر دھیان نہیں دیا، اسی طرح عادت بن جاتی ہے اور انسان فقیروں سے بے اعتناء ہو کر گزرنے لگتا ہے، ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ فقیروں کی بابت بالکل بے حس ہو جائے گا اور اس کے اندر فقیروں کی موجودگی کا احساس تک مٹ جائے گا۔

چھوٹی عادت، تناور خصلت کا پیش خیمہ

بہت چھوٹی چھوٹی چیزیں کبھی بڑھ کر بہت بڑی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اچھی چیزیں بھی ایسی ہوتی ہیں اور بُری بھی۔ عادتیں بھی اکثر بالکل اسی طرح رشد و نمو حاصل کرتی ہیں جس طرح انسان

پیدائش کے بعد سے ارتقاء و تکامل حاصل کرتا ہے۔انسان کی پیدائش ایک بہت ہی چھوٹے نامرئی قطرے سے ہوتی ہے۔جو نہ قابلِ وزن ہے اور نہ قابلِ رویت، نہ ہی اس کا کسی آلے سے وزن کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے انسانی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن یہی نامرئی قطرہ کہ جو قابلِ دید نہیں ایک محفوظ اور مناسب ماحول میں پروان چڑھ کر ایک عظیم جثہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، بعد ازاں رشد و نمو کے مراحل طے کرتے ہوئے ایک ہٹا کٹا انسان بن جاتا ہے۔

عادتیں بھی اسی طرح جنم لیتی ہیں اور اسی طرح پرورش بھی پاتی ہیں۔عادتوں کا نطفہ بھی اسی طرح نامرئی ہوتا ہے، ایک چھوٹا سا کام، ایک چھوٹی سی حرکت ایک بہت بڑی عادت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔جس طرح سے انسان کی رشد و نمو عورتوں کے رحم اور مردوں کے صلب میں ہوتی ہے اسی طرح عادتیں بھی یہی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہیں۔ایک معمولی سا عمل نطفہ بن کر رحم میں چلا جاتا ہے، پلتا ہے، بڑھتا ہے اور وہ رحم اس کو پال پوس کر ایک بہت بڑی تناور عادت کی شکل میں جنم دیتا ہے۔جب انسان کے وجود میں ایک عادت کی ولادت ہو جائے تو پھر وہ عادت رکتی نہیں بلکہ مسلسل آگے بڑھتی رہتی ہے۔یہ جو بڑے بڑے ہیروئن نوش اور شراب خور ہیں انہوں نے بھی ایک دن صرف ایک گھونٹ پیا تھا اور ایک گھونٹ ایک بہت بُری عادت کی بنیاد کے لیے کافی ہوتا ہے۔

لہٰذا دین نے جو گناہوں کے ارتکاب سے انسان کو روکا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہوں کی عادت پختہ ہونے کے بعد اس کا تدارک کیا جائے بلکہ گناہ کو پیدائش سے پہلے ہی ختم کر دو۔ اجنبی کی طرف نگاہ نہ کرو یہ تیرِ شیطان ہے یعنی اگر یہ نطفہ ایک دفعہ اس رحم میں چلا گیا اور ایک تناور عادت کی شکل اختیار کر کے متولد ہو گیا تو پھر اس پر قابو نہیں پا سکتے۔دین کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو اسی

مرحلے میں ختم کر دیا جائے، ولادت سے پہلے اسے انجام تک پہنچا دیا جائے۔

آج کل خاندانی منصوبہ بندی کی جاتی ہے لیکن عادات کی منصوبہ بندی نہیں ہو رہی ہے، اگر عادات کی ولادت کی منصوبہ بندی کی جائے تو معاشرے میں اتنے مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔ لہٰذا ایک بہت چھوٹی چیز سے بے اعتنائی ایک بہت بڑی بے حسی کا باعث بن جاتی ہے۔ ایسی بے حسی کہ جو انسان کو ہر قسم کے درد سے بیگانہ کر دیتی ہے حتیٰ کہ درد کا احساس تک مٹ جاتا ہے۔ اگر ہم چھوٹے چھوٹے حقوق کا خیال رکھنا شروع کر دیں تو بڑے حقوق کی پائمالی کا راستہ رک جاتا ہے مثلاً دسترخوان پر بیٹھنے کا جتنا حق آپ کا ہے اتنا ہی ساتھ بیٹھے ہوئے انسان کا بھی ہے، اگر آپ نے چھوٹا سا لقمہ اس کے حصہ سے زیادہ توڑ لیا تو ایک حق کو آپ نے یہاں پر پائمال کر دیا۔ شاید آپ کو اس حق کی پائمالی کا پتہ بھی نہ چلے اس لیے کہ یہ اتنا چھوٹا اور نامرئی حق تھا کہ آپ کو نظر نہیں آیا لیکن یہی نظر نہ آنے والا حق ممکن ہے کل کو ایک بہت بڑی بے حسی میں تبدیل ہو جائے، ایک چھوٹے سے حق سے بے اعتنائی ایک عظیم حق سے بے حسی کا آغاز بن سکتی ہے۔

مولا علی علیہ السلام کی نظر میں چھوٹے حقوق کی اہمیت

امیر المومنین علیہ السلام اپنے اوجِ اقتدار کے دور میں کہ جب آپ ایسی سلطنت کے مالک ہیں کہ جس کے پاس فوج ہے، لشکر ہے، قدرت ہے، شمشیر ہے، شجاعت ہے، کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور ہر کام کرنے پر قادر ہیں لیکن نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۱ میں فرماتے ہیں کہ

وَاللّٰهِ لَاَنْ اَبِيْتَ عَلٰى حَسَكِ السَّعْدَانِ مُسَهَّدًا.....

خدا گواہ ہے کہ میرے لئے سعدان کی خاردار جھاڑی پر جاگ کر رات گزار لینا یا زنجیروں میں قید ہو کر کھینچا جانا اس امر سے زیادہ عزیز ہے کہ میں روزِ قیامت پروردگار سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ کسی بندے پر ظلم کر چکا ہوں یا دنیا کے کسی معمولی مال کو غصب کیا ہو.....

اور پھر آگے اسی خطبہ میں مزید فرمایا کہ

خدا کی قسم !اگر مجھے ہفت اقلیم کی حکومت تمام زیر آسمان دولتوں کے ساتھ دے دی جائے اور مجھ سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ میں کسی چیونٹی پر صرف اس قدر ظلم کروں کہ اس کے منہ سے اس چھلکے کو چھین لوں جو وہ چبا رہی ہے تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتا ہوں.....

یعنی اگر مجھے پوری دنیا کی متاع کی لالچ دی جائے یا دھمکی دی، چونکہ یہی دونوں چیزیں انسان کو بہکاتی ہیں یعنی لالچ میں وہ کچھ دیا جائے اور دھمکی میں یہ کچھ میرے ساتھ کیا جائے تو میں خارِ مغیلاں (صحرائی کانٹے) پر گھسیٹا جانا قبول کروں گا لیکن اس چیونٹی کے منہ سے یہ جَو کا چھلکا لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ چیونٹی کی جسامت دیکھئے پھر اس کا منہ دیکھئے اور اس میں آیا ہوا چھلکا دیکھئے لیکن امیر المومنین علیہ السلام اس کو بھی زبردستی لینے پر آمادہ نہیں ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہم نے مولا علی علیہ السلام کو اسوہ کے طور پر نہیں مانا اسی لیے تو ہم چیونٹیوں کے بل ویران کر دیتے ہیں۔ چیونٹیاں تو کہاں بلکہ ہم تو انسانوں کے بڑے بڑے حقوق بہت آسانی سے پائمال کر جاتے ہیں، ہم تو خدا کے حقوق بھی پائمال کر دیتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام ایک

چھوٹے سے حَشَرہ کا حق پائمال کرنے کے لیے تیار نہیں، کیوں؟ آخر ایک چیونٹی کے منہ سے اگر چھلکا چھین لیا جائے تو وہ دوسرا چھلکا اٹھالے گی، اس میں کیا حرج ہے؟ لیکن نہیں، حضرت علی علیہ السلام یہ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں اس لیے کہ یہ چھوٹے سے حق کی پائمالی، چھوٹے سے حق کی طرف سے بے اعتنائی اور بے توجہی کل ایک بہت بڑی بے حسی میں بدل سکتی ہے لہٰذا اسی خلافت و امارت کے زمانے میں حضرت علی علیہ السلام کو نیند نہیں آتی تھی، کیوں؟ اس لیے کہ یمن میں کوئی بھوکا نہ ہو، اسی دور میں کچھ ایسے بے حس بھی ہیں کہ جو دن کو بھی سوتے ہیں اور رات کو بھی سوتے ہیں۔ کوفہ میں ہزاروں بھوکے تھے لیکن ان کوفیوں کو کوئی خبر نہیں تھی، خود اپنے ہمسائے میں ہزاروں بھوکے تھے لیکن ان کو کوئی خبر نہیں تھی۔

بے اعتنائی انسان کو بے حس بنا دیتی ہے خصوصاً جب انسان حق کی طرف بے اعتناء اور لا پروا ہو جائے۔ دو آدمیوں میں جب نزاع ہو اور ان میں سے ایک حق بجانب ہو تو کوئی شخص اس کی حمایت نہ کرے اور بے اعتناء ہو کر اس جگہ سے گزر جائے تو اس سے آہستہ آہستہ وہ بے حس بن جاتا ہے۔ عموماً غیر جانبداری کو ہم فضیلت سمجھتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں کیا پڑی ہے خود سنبھالو۔ یہ چھوٹے چھوٹے حقوق سے گزر جانا، ان کو پھلانگ دینا بڑے بڑے حقوق کی پائمالی کا موجب بنتا ہے۔ یہ بے اعتنائی انسان کو بے حس بنا دیتی ہے۔ یہ نہ دیکھو کہ حق کس کا ہے؟ حق جس کا بھی ہو حق ہے، آپ برحق کو نہ دیکھو بلکہ حق دیکھو، اگر آپ کا دشمن بھی حق پر ہے تو حق کی حمایت ضرور کرو، دشمن کو نہ دیکھو بلکہ حق کو دیکھو، حق کا احترام کرو اگرچہ وہ مخالف کے پاس ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے انسان حق کا حامی بن جاتا ہے، حق کا احساس انسان کے اندر جنم لیتا ہے اور وہ حق کا طرفدار بن جاتا ہے۔ ایک دفعہ انسان اگر حق سے بے حس ہو جائے تو پھر بڑے بڑے حق بھی اگر اس کے سامنے پائمال ہو جائیں لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

بے حسی کی انتہا اور انجام

بے حسی پھیلتے پھیلتے وباء کی شکل اختیار کر لیتی ہے یعنی بے حسی جب افراد سے بڑھ کر سماج میں آجائے تو وباء بن جاتی ہے۔ جب کوئی بیماری کسی انسان کو لاحق ہو جائے تو اسے ہم بیماری کا نام ہی دیتے ہیں لیکن اگر یہ بیماری پورے معاشرے میں پھیل جائے تو پھر اسے وباء کہتے ہیں مثلاً اگر محلے میں دو تین آدمیوں کو بخار ہو جائے تو یہ ایک عام بخار کی کیفیت ہے لیکن اگر پورا محلّہ اس بخار کا شکار ہو جائے تو اس صورت میں ہم کہتے ہیں کہ بخار کی وباء آئی ہوئی ہے۔ لہٰذا بے حسی بھی جب تک چند افراد میں رہے تو اگرچہ یہ بھی بہت خطرناک ہے لیکن وباء نہیں، اگر پورا معاشرہ ہی بے حسی کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو پھر یہ وباء کہلاتی ہے۔ اس صورت میں یہ وباء پورے معاشرے کو نیست و نابود کر دیتی ہے، بے حسی کی وباء سخت ترین ہے، انسان جب حق کی نسبت بے اعتنا ہو جائے، حق کو کچلتے ہوئے دیکھ کر اظہارِ افسوس تک نہ کرے تو پھر یہ بے حسی ایک بہت بڑے المیہ کو جنم دیتی ہے۔

اقوام کی بے حسی، انبیاء علیہم السلام کی راہ میں بڑی رکاوٹ

تاریخِ بشری میں سب سے المناک واقعہ اس وقت رونما ہوتا ہے کہ جب کوئی داعی حق جو خدا کی طرف سے مبعوث ہو وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ جب قوم بے حس ہو جائے تو حضرت نوح علیہ السلام جیسا نبی بھی تنہا رہ جاتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَهَارًا ۝ۙ[1]

نوحؑ نے کہا: پروردگارا! میں اپنی قوم کو رات دن دعوت دیتا رہا۔

میری دعوت نے نہ صرف ان پر اثر نہیں کیا بلکہ:

فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ۝[2]

لیکن میری دعوت نے ان کے گریز میں اضافہ ہی کیا۔

انبیاء علیہم السلام کا یہ درد تھا کہ انہیں بے حس اقوام سے واسطہ پڑا، انہوں نے چھوٹے چھوٹے حقوق میں بے اعتنائی کی اور بڑے بڑے حقوق میں بے حسی کا ثبوت دیا۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی بارگاہ میں فریادیں کی ہیں کہ اے پروردگار بے حس قوم سے واسطہ پڑ گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بے حسی کے درد سے نالاں ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بے حسی کے ہاتھوں یہ منظر دیکھنا پڑا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے حسی کے ہاتھوں ہجرت کی اس لیے کہ آپؐ ایک بے حس معاشرے میں مبعوث ہوئے، باوجودیکہ مکہ سرزمینِ وحی اور حرمِ الٰہی ہے مگر وہاں کا معاشرہ بے حس تھا، اگر مدینہ میں اس سلسلہ کا آغاز ہوتا اور اسی میں جاری رکھنا ہوتا تو اللہ تعالیٰ پہلے سے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا اہتمام مدینہ میں کرتا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں ہی پیدا ہوتے، دوسری صورت میں اللہ تعالیٰ بعثت سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ جانے کے لیے حکم دیتا کہ جائیں آپؐ پر پہلی وحی مدینہ میں

۱.....سورۂ نوح، آیہ ۵ ۲.....سورۂ نوح، آیہ ۶

ہی نازل ہوگی لیکن سب سے پہلی وحی مکہ میں نازل ہوتی ہے پھر ایک مدتِ مَدِیْد گزرنے کے بعد حکم ہوتا ہے کہ مکہ چھوڑ دو، اس لیے کہ مکہ بے حس ہو چکا ہے اور بے حس سرزمین پر اب دوبارہ وحی نازل نہیں ہوگی، اب ایک باحس اور با احساس سرزمین پر چلے جایئے۔ لہٰذا مدینہ ایک با احساس معاشرہ تھا، اگرچہ مدینہ کے باشندے اہلِ کتاب تھے لیکن بے حس نہیں تھے، مکہ والے اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ دار و عزیز تھے لیکن حق کی نسبت بے حس تھے لہٰذا خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو ان بے حسوں سے نکالا اور با احساس لوگوں میں جانے کا حکم دیا۔ بے حسی بڑے بڑے المیوں کو جنم دیتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سب سے بڑا المیہ جو پیش آیا وہ اسی بے حسی کا نتیجہ تھا۔

◄◄ واقعۂ غدیر کی فراموشی، بے حسی کا نتیجہ

آج لوگ تعجب کرتے ہیں اور یہ واقعاً ایک سوال ہے، اہل سنت اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا جانشین مقرر کیا ہو اور وہ برجستہ اور عظیم صحابی، وہ نیک ہستیاں، وہ صالح وعبادت گزار اصحاب واہل جہاد اور عظیم شخصیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو ٹھکرا دیں؟ حتیٰ کہ ہمارے بعض امامیہ بھی یہی پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟ اتنی کم مدت میں لوگ واقعۂ غدیر کو بھول گئے؟ مگر یہ ممکن ہے، یہ ہوسکتا ہے اور ہوا بھی، جب لوگ حق سے بے اعتنا ہونا شروع کردیں تو یہ بے اعتنائی آہستہ آہستہ ایک دن بے حسی میں بدل جاتی ہے، جیسا کہ اٹھارہ ذی الحجہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان کیا اور اٹھائیس صفر کو اس دنیا سے رحلت فرمائی یعنی دو مہینہ دس دن میں لوگوں کی بے اعتنائی کا نتیجہ بے حسی نکلا۔

ایسی بے حسی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحلت کر گئے تو پورے مدینہ میں حق کے دفاع کے لیے ایک انسان کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ پورا مدینہ کہ جس کے اندر کسی زمانے میں بااحساس لوگ تھے بعض علل واسباب کی وجہ سے اتنی بے حسی کا شکار ہوئے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کے علاوہ کسی نے بھی لب کشائی نہیں کی۔ حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام حق کے دفاع کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں کیونکہ زندگی میں کبھی بھی حق سے بے اعتنائی نہیں برتی، آپ علیہا السلام نے کسی کا ایک چھوٹا سا حق بھی نہیں کچلا لہٰذا آپ علیہا السلام حق کی بابت بے حس نہیں ہوئیں۔ عام دروازوں کو کھٹکھٹایا تو بے حس دروازوں سے کوئی بھی مدد کیلئے نہیں نکلا۔ بے حس دروازوں کو ہزار دستک دیتی رہیں لیکن ان سے کوئی جواب نہیں آیا۔

آج بھی کوئی ہمارے دروازوں پر دستک دے تو ہم کہتے ہیں جاؤ بابا کسی اور دروازے پر جاؤ۔ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ یہ فقیر جو آپ کے در پر آتا ہے تو یہ خود نہیں آتا بلکہ یہ خدا کا بھیجا ہوا ہے چنانچہ آپ علیہ السلام نے تاکید کی کہ

''غریب و مسکین اللہ کا فرستادہ ہوتا ہے، تو جس نے اس سے اپنا ہاتھ روکا اس نے خدا سے ہاتھ روکا اور جس نے اسے کچھ دیا اس نے خدا کو دیا''[1]۔ فقیر سے بے اعتنائی برتنا بے حسی کی طرف پہلا قدم ہے، جب بے حسی کی انتہا ہو جائے تو پھر حضرت فاطمۃ الزہرا علیہا السلام جیسی ہستی بھی اگر دروازہ پر دستک دے اور مدد کے لیے بلائے تو لوگ جواب دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔

---

[1]..... اِنَّ الْمِسْكِيْنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَمَنْ مَنَعَهُ فَقَدْ مَنَعَ اللّٰهَ وَمَنْ اَعْطَاهُ فَقَدْ اَعْطَى اللّٰهَ. (حکمت ۳۰۴)

مولا علی علیہ السلام، بے حسوں کے درمیان

ایک اور نمونہ آپ کی خدمت میں تحریر کرتا ہوں تا کہ معلوم ہو جائے کہ بے حسی انسان کے ساتھ کیا کرتی ہے۔انبیاء علیہم السلام پر جتنے مظالم ڈھائے گئے ان میں سے بے حسی کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔تاریخ میں پوری کائنات میں اتنا ظلم کسی کے ساتھ نہیں ہوا جو امام حق حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔مظلوم ترین انسان کہ جس پر اتنے جور وستم کئے گئے کہ اول مظلومِ کائنات بنے۔آپ علیہ السلام پر یہ مظالم کس کے ہاتھوں ڈھائے گئے؟ آیا کسی ستمگر، ظالم اور جابر کے ہاتھوں ڈھائے گئے؟ نہیں، بلکہ آپ علیہ السلام پر یہ سارے مظالم بے حسی کے ہاتھوں ڈھائے گئے؟ امیر المومنین علی علیہ السلام کا بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑا مثلاً مکہ کے مشرکین سے واسطہ پڑا، مدینہ میں یہود ونصاریٰ سے واسطہ پڑا، منافقوں سے واسطہ پڑا، امیر شام، اصحاب جمل، اصحاب صفین، اصحاب نہروان سے واسطہ پڑا لیکن علی علیہ السلام نے کبھی یہ شکوہ نہیں کیا کہ خدایا مجھے ان سے کیوں واسطہ پڑا؟ کبھی نہیں کہا کہ خدایا مجھے عمرو ابن عبدود، مرحب، عنتر، عمرو بن عاص اور معاویہ ابن ابی سفیان سے کیوں واسطہ پڑا؟! بلکہ آپ علیہ السلام کی زبان پر اگر شکوہ آیا بھی تو یہی آیا کہ خدایا یہ کس جرم کی سزا ہے کہ میرے حصے میں سب بے حس آ گئے۔

بے حس دوستوں کے ہاتھوں امیر المومنین علیہ السلام نے جو مظالم برداشت کئے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی کیونکہ بے حس افراد پر مشتمل لشکر تشکیل دیا جائے تو پورا لشکر بے حس ہوگا۔ان ہی بے حسوں کے درمیان احساس رکھنے والے امامِ حق کی فریادیں نکلتی ہیں۔علی علیہ السلام کی آہیں، علی علیہ السلام کی حسرتیں ان ہی بے حسوں کے ہاتھوں تھیں۔لوگوں کی بے حسی نے حضرت علیؑ جیسے قدرت مند حاکم کے ساتھ کیا کیا؟ رعایا اور بے حس انسانوں کے ہاتھوں کیسا وقت دیکھنا پڑا؟ کیسے جملے سننے پڑے؟ یہاں پر شہید

جنرل صیاد شیرازی کا وہ جملہ کہ جو اس نے ایران، عراق جنگ بندی پر کہا تھا نقل کرتا ہوں، کہا کہ جب جنگ بندی کا اعلان ان الفاظ کے ساتھ ہوا کہ امام امتؒ فرما رہے تھے:

میں زہر کا پیالہ پی رہا ہوں۔

اس وقت میں محاذِ جنگ پر تھا، پھر محاذ سے واپس ہوا تو مجھے ایک سال تک جرأت نہیں ہوئی کہ امام خمینیؒ کی خدمت میں حاضر ہوسکوں، امامِ امتؒ سے آنکھیں دو چار کرسکوں، اس لیے کہ امام خمینیؒ نے فرمایا ہے کہ میں زہر کا پیالہ پی رہا ہوں اور یہ میرے لیے ننگ ہے، بھلا یہ کیسے ہوا کہ صیاد زندہ ہو اور رہبر زہر کا پیالہ پینے پر مجبور ہو جائے، رہبر کے زہر کے پیالہ پینے تک میں زندہ کیوں رہا؟

اسی طرح صفین میں جنگ بندی کے زہر کا پیالہ امام علی علیہ السلام نے کیوں پیا؟ کیا معاویہ کی قدرت، عمرو ابن عاص کی مکاری نے آپ کو مجبور کیا تھا؟ نہیں، صرف ایک چیز نے مولا علی علیہ السلام کو زہر کا پیالہ پلایا اور صفین میں جنگ بندی کا اعلان کروایا۔ مالک اشترؒ کو نصرت و فتح کے ایک نیزے کے فاصلے سے واپس آنا پڑا [1]، مالک اشترؒ جب واپس ہوئے تو مالکؒ کے یہی الفاظ تھے کہ ننگ ہو مالک پر! مالک زندہ ہو اور علیؑ جنگ بندی پر مجبور ہو جائے۔

---

[1]...... مفتی جعفر حسین اعلیٰ اللہ مقامہ، خطبہ ۲۰۶ کے ذیل میں ابن ابی الحدید سے نقل کرتے ہیں: خلص الاشتر الی معاویة فاخذه بعنقه، و لم یکن بقی من قوّة الشام الا کحرکة ذنب الوزعة عند قتلها یضرب یمینا و شمالا (شرح ابن ابی الحدید، جلد۳، صفحہ۱۰)۔ ''مالک اشترؒ معاویہ تک پہنچ چکے تھے اور اسے گردن سے پکڑ لیا تھا اور شامیوں کا سارا دم خم جاتا رہا تھا، بس ان میں ایسی ہی حرکت باقی رہ گئی تھی جیسے چھپکلی کو مار دیا جائے تو اس کی دُم دائیں بائیں اچھلتی رہتی ہے''۔

یہ سب کچھ کس کے ہاتھوں ہوا؟ بے حسی کے ہاتھوں ہوا۔ لوگوں کی بے حسی نے امیر المومنین حضرت امام علی علیہ السلام کو جنگِ صفین میں زہر کا پیالہ پلایا۔

بے حسی، سب سے بڑا درد

نہج البلاغہ میں کئی خطبے ہیں جہاں پر آپ علیہ السلام نے اپنے اصحاب کی مذمت کی ہے، ''فِـــیْ ذَمِّ اَصْحَابِہٖ'' کے عنوان سے بہت سارے خطبے موجود ہیں۔[1]

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

۱۔ یَا اَھْلَ الْکُوْفَۃِ مُنِیْتُ بِکُمْ بِثَلَاثٍ وَ اثْنَتَیْنِ:.....[2]

ترجمہ: اے اہلِ کوفہ! میں تمہاری تین اور ان کے علاوہ دو باتوں میں مبتلا ہوں، پہلی تو یہ کہ تم کان رکھتے ہوئے بہرے ہو اور بولنے چالنے کے باوجود گونگے ہو اور آنکھیں ہوتے ہوئے اندھے ہو، اور پھر یہ کہ نہ تم جنگ کے موقع پر سچے جوانمرد ہو اور نہ مصیبت کے وقت قابلِ اعتماد بھائی ہو، اے ان اونٹوں کی چال ڈھال والوں کہ جن کے چرواہے گُم ہو چکے ہوں اور انہیں ایک طرف سے گھیر کر لایا جاتا ہے تو دوسری طرف سے بکھر جاتے ہیں۔ خدا کی قسم! جیسا کہ میرا تمہارے متعلق یہ خیال ہے گویا یہ منظر میرے سامنے ہے کہ اگر جنگ شدت اختیار کر لے اور میدانِ کارزار گرم ہو جائے تو تم ابن ابی طالبؑ

۱.....حضرت علی علیہ السلام کی مظلومیت اور اس بے حسی کے ہاتھوں فریادوں کے چند نمونے نہج البلاغہ سے اقتباس کر کے بیان کئے جا رہے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ بے حسی کتنا بڑا درد ہے۔

۲.....نہج البلاغہ، خطبہ ۹۵

سے ایسے شرمناک طریقے پر علیحدہ ہو جاؤ جیسے عورت بالکل برہنہ ہو جائے۔

۲۔ اَیُّھَا النَّاسُ الْمُجْتَمِعَۃُ اَبْدَانُھُمْ وَالْمُخْتَلِفَۃُ اَھْوَاؤُھُمْ..... [۳]

ترجمہ: اے وہ لوگو! جن کے جسم یکجا اور خواہشیں جدا جدا ہیں، تمہاری باتیں تو سخت پتھروں کو بھی نرم کر دیتی ہیں اور تمہارا عمل ایسا ہے کہ جو دشمنوں کو تم پر دندان آز تیز کرنے کا موقع دیتا ہے، اپنی مجلسوں میں تو تم کہتے پھرتے ہو کہ یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے اور جب جنگ چھڑ ہی جاتی ہے تو تم اس سے پناہ مانگنے لگتے ہو۔ جو تم کو مدد کے لیے پکارے اس کی صدا بے وقعت اور جس کا تم جیسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہو اس کا دل ہمیشہ بے چین ہے، غلط سلط حیلے حوالے ہیں اور مجھ سے جنگ میں تاخیر کرنے کی خواہشیں ہیں جیسے نادہندہ مقروض اپنے قرض خواہ کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ذلیل آدمی ذلت آمیز زیادتیوں کی روک تھام نہیں کر سکتا اور حق تو بغیر کوشش کے نہیں ملا کرتا، اس گھر کے بعد اور کون سا گھر ہے جس کی حفاظت کرو گے اور میرے بعد اور کس امام کے ساتھ ہو کر جہاد کرو گے۔

خدا کی قسم! جسے تم نے دھوکا دے دیا ہو اس کے فریب خوردہ ہونے میں کوئی شک نہیں اور جسے تم جیسے لوگ ملے ہوں تو اس کے حصہ میں وہ تیر آتا ہے جو خالی ہوتا ہے اور جس نے تم کو (تیروں کی طرح) دشمنوں پر پھینکا ہو اس نے گویا ایسا تیر پھینکا ہے جس کا سوفار ٹوٹ چکا ہو اور پیکان بھی شکستہ ہو۔ خدا کی قسم! میری کیفیت تو اب یہ ہے کہ نہ میں تمہاری کسی بات کی تصدیق کر سکتا ہوں اور نہ تمہاری نصرت کی مجھے آس باقی رہی ہے اور نہ تمہاری وجہ سے دشمن کو جنگ کی دھمکی دے سکتا ہوں، تمہیں کیا

۳..... نہج البلاغہ، خطبہ ۲۹

ہو گیا؟ تمہارا مرض کیا ہے؟ اور اس کا چارہ کیا ہے؟ اس قوم (اہل شام) کے افراد بھی تو تمہاری ہی شکل و صورت کے مرد ہیں۔ کیا باتیں ہی باتیں رہیں گی، جانے بوجھے بغیر اور صرف غفلت و مدہوشی ہے۔ تقویٰ و پرہیزگاری کے بغیر (بلندی کی) حرص ہی حرص ہے مگر بالکل ناحق۔

۳۔ لَقَدْ كُنْتُ أَمْسِ أَمِيرًا فَأَصْبَحْتُ الْيَوْمَ مَأْمُورًا...... [۱]

میں کل تک امر و نہی کا مالک تھا اور آج دوسروں کے امر و نہی پر مجھے چلنا پڑ رہا ہے۔

۴۔ وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي ذَمِّ أَصْحَابِهِ: كَمْ أُدَارِيكُمْ كَمَا تُدَارَى الْبِكَارُ الْعَمِدَةُ...... [۲]

ترجمہ: اپنے اصحاب کی مذمت میں فرمایا: کب تک میں تمہارے ساتھ ایسی نرمی اور رُو رعایت کرتا رہوں گا جیسی ان اونٹوں سے کی جاتی ہے جن کی کوہانیں اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہوں اور ان پھٹے پرانے کپڑوں سے کہ جنہیں ایک طرف سے سیا جائے تو دوسری طرف سے پھٹ جاتے ہیں۔ جب بھی شامیوں کے ہراول دستوں میں سے کوئی دستہ تم پر منڈلاتا ہے تو تم سب کے سب (اپنے گھروں کے) دروازے بند کر لیتے ہو اور اس طرح اندر دبک جاتے ہو جس طرح گوہ اپنے سوراخ میں اور بجّو اپنے بھٹ میں۔ جس کے تمہارے ایسے مددگار ہوں اسے تو ذلیل ہی ہونا ہے اور جس پر تم (تیر کی طرح) پھینکے جاؤ تو گویا اس پر ایسا تیر پھینکا گیا جس کا سوفار بھی شکستہ اور پیکان بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ خدا کی قسم! (گھروں کے) صحن میں تو تم بڑی تعداد میں نظر آتے ہو لیکن جھنڈوں کے نیچے تھوڑے سے، میں اچھی

بخل کی سب سے بڑا اورد

---

[۱]...... نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۶ [۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۶۷

طرح جانتا ہوں کہ کس چیز سے تمہاری اصلاح ہوسکتی ہے اور کس چیز سے تمہاری کجروی کو دور کیا جا سکتا ہے لیکن میں اپنے نفس کو بگاڑ کر تمہاری اصلاح کرنا نہیں چاہتا......

۵۔ وَمِنْ خُطْبَةٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ ذَمِّ اَهْلِ الْعِرَاقِ: اَمَّا بَعْدُ يَا اَهْلَ الْعِرَاقِ فَاِنَّمَا اَنْتُمْ كَالْمَرْأَةِ الْحَامِلِ......[۱]

ترجمہ: اہلِ عراق کی مذمت میں فرمایا: اے اہلِ عراق! تم اس حاملہ عورت کی مانند ہو جو حاملہ ہونے کے بعد جب حمل کے دن پورے کرے تو مرا ہوا بچہ گرادے اور اس کا شوہر بھی مر چکا ہو اور رنڈاپے کی مدت بھی دراز ہوگئی ہو اور (قریبی نہ ہونے کی وجہ سے) دور کے عزیز ہی اس کے وارث ہوں۔ بخدا میں تمہاری طرف بخوشی نہیں آیا بلکہ حالات سے مجبور ہوکر آ گیا۔ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تم کہتے ہو کہ علیؑ کذب بیانی کرتے ہیں، خدا تمہیں ہلاک کرے (بتاؤ) میں کس پر جھوٹ باندھ سکتا ہوں، کیا اللہ پر؟! تو میں سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والا ہوں، یا اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر؟! تو میں سب سے پہلے ان کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ خدا کی قسم! ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ ایک ایسا اندازِ کلام تھا جو تمہارے سمجھنے کا نہ تھا اور نہ تم میں اس کے سمجھنے کی اہلیت تھی، خدا تمہیں سمجھے۔ میں تو بغیر کسی عوض کے (علمی جواہر ریزے) ناپ ناپ کر دے رہا ہوں، کاش کہ ان کے لئے کسی کے ظرف میں سمائی ہوتی، (ٹھہرو) کچھ دیر بعد تم بھی اس کی حقیقت کو جان لو گے۔

۶۔ مُنِيْتُ بِمَنْ لَا يُطِيْعُ اِذَا اَمَرْتُ وَلَا يُجِيْبُ اِذَا دَعَوْتُ...... [۲]

---

[۱]...... نہج البلاغہ، خطبہ ۶۹ [۲]...... نہج البلاغہ، خطبہ ۳۹

ترجمہ: میرا ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جنہیں حکم دیتا ہوں تو مانتے نہیں، بلاتا ہوں تو آواز پر لبیک نہیں کہتے، تمہارا بُرا ہو، اب اپنے رب کی نصرت کرنے میں تمہیں کس چیز کا انتظار ہے؟ کیا دین تمہیں ایک جگہ اکٹھا نہیں کرتا اور غیرت و حمیّت تمہیں جوش میں نہیں لاتی؟ میں تم میں کھڑا ہو کر چلاّتا ہوں اور مدد کے لیے پکارتا ہوں لیکن تم نہ میری کوئی بات سنتے ہو، نہ میرا کوئی حکم مانتے ہو، یہاں تک کہ ان نافرمانیوں کے بُرے نتائج کھل کر سامنے آجائیں۔ نہ تمہارے ذریعے خون کا بدلہ لیا جا سکتا ہے اور نہ کسی مقصد تک پہنچا جا سکتا ہے، میں نے تم کو تمہارے ہی بھائیوں کی مدد کے لیے پکارا تھا مگر تم اس اونٹ کی طرح بلبلانے لگے جس کی ناف میں درد ہو رہا ہو اور اس لاغر و کمزور شتر کی طرح ڈھیلے پڑ گئے جس کی پیٹھ زخمی ہو، پھر میرے پاس تم لوگوں کی ایک چھوٹی سی متزلزل و کمزور فوج آئی، اس عالم میں کہ گویا اسے اس کی نظروں کے سامنے موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

۷۔ اَمَّا بَعۡدُ فَاِنَّ الۡجِهَادَ بَابٌ مِنۡ اَبۡوَابِ الۡجَنَّةِ فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَةِ اَوۡلِيَآئِهِ...... [۱]

ترجمہ: جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے اللہ نے اپنے خاص دوستوں کے لیے کھولا ہے...... میں نے اس قوم سے لڑنے کے لیے رات بھی اور دن بھی، علانیہ بھی اور پوشیدہ بھی تمہیں پکارا اور للکارا اور تم سے کہا کہ قبل اس کے کہ وہ جنگ کے لیے بڑھیں تم ان پر دھاوا بول دو۔ خدا کی قسم! جن افرادِ قوم پر ان کے گھروں کی حدود کے اندر ہی حملہ ہو جاتا ہے وہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں، لیکن تم نے جہاد کو دوسروں پر ٹال دیا اور ایک دوسرے کی مدد سے پہلو بچانے لگے، یہاں تک کہ تم پر

۱...... نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

غارت گریاں ہوئیں اور تمہارے شہروں پر زبردستی قبضہ کرلیا گیا......تم تو تیروں کا ازخود نشانہ بنے ہوئے ہو، تمہیں ہلاک و تاراج کیا جارہا ہے مگر تمہارے قدم حملے کے لیے نہیں اٹھتے، وہ تم سے لڑ بھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو، اللہ کی نافرمانیاں ہو رہی ہیں اور تم راضی ہو رہے ہو، اگر گرمیوں میں تمہیں ان کی طرف بڑھنے کے لیے کہتا ہوں تو تم یہ کہتے ہو کہ یہ انتہائی شدت کی گرمی کا زمانہ ہے، اتنی مہلت دیجیے کہ گرمی کا زور ٹوٹ جائے، اور اگر سردیوں میں چلنے کے لیے کہتا ہوں تو تم یہ کہتے ہو کہ کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے، اتنا ٹھہر جائیے کہ سردی کا موسم گزر جائے، یہ سب سردی اور گرمی سے بچنے کے لیے باتیں ہیں، جب تم سردی اور گرمی سے اس طرح بھاگتے ہو تو پھر خدا کی قسم! تم تلواروں کو دیکھ کر اس سے کہیں زیادہ بھاگو گے۔

اے مردوں کی شکل وصورت والے نامردو! تمہاری عقلیں بچوں کی سی اور تمہاری سمجھ حُجلہ نشین عورتوں کی مانند ہے۔ میں تو یہی چاہتا تھا کہ نہ تم کو دیکھتا، نہ تم سے جان پہچان ہوتی، ایسی شناسائی جو ندامت کا سبب اور رنج واندوہ کا باعث بنی ہے۔ اللہ تمہیں مارے، تم نے میرے دل کو پیپ سے بھر دیا ہے اور میرے سینے کو غیظ وغضب سے چھلکا دیا ہے، تم نے مجھے غم وحزن کے جرعے پے در پے پلائے، نافرمانی کر کے میری تدبیر ورائے کو تباہ کر دیا، یہاں تک قریش کہنے لگے کہ علیؑ ہے تو مردِ شجاع لیکن جنگ کے طور طریقوں سے واقف نہیں۔ اللہ ان کا بھلا کرے کیا ان میں سے کوئی ہے جو مجھ سے زیادہ جنگ کی مزاولت رکھنے والا اور میدان وغا میں میرے پہلے سے کارِ نمایاں کئے ہوئے ہو، میں تو ابھی بیس برس کا بھی نہ تھا کہ حرب وضرب کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، اور اب تو ساٹھ سے بھی اوپر ہو گیا ہوں لیکن اس کی رائے ہی کیا جس کی بات نہ مانی جائے۔

یہاں تک ہم یہ نتیجہ لے سکتے ہیں کہ اہلِ کوفہ حق کی بابت بے حس ہو چکے تھے اور یہ بے حسی وباء بن چکی تھی جو پوری امت کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی، اس لیے اہل کوفہ حق کو نہیں بچا سکے، حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس مرض کا مداوا کیا اور اس کی جڑیں کاٹ کر پھینک دیں۔

فلسفۂ قیام، بے حسی کا خاتمہ

اگر کوئی پوچھے کہ امام حسین علیہ السلام نے یہ قیام کیوں کیا؟ اس کا مقصد اور فلسفہ کیا ہے؟ جواب یہی ہے کہ آپ نے بے حسی کے خاتمہ کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے، جب آپ علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ امت حق کی بابت بے اعتنائی کر کے بے حس ہو چکی ہے اور اس کی علامت بھی یہ ہے کہ یزید جیسا فاسق و فاجر حکمران بن بیٹھا ہے اور امت بھی خاموش ہی خاموش ہے۔ لہٰذا اگر امام حسین علیہ السلام سے پوچھا جائے کہ آپؑ نے قیام کیوں فرمایا؟ کیا حکمت تھی کیا فلسفہ تھا؟ آپ اپنی زندگی کے آرام اور چین کو خراب کر کے، اپنی اولاد سمیت کیوں اس خونین معرکہ میں کود پڑے؟ تو یہی جواب دیں گے:

وَعَلَى الْاِسْلَامِ السَّلَامُ اِذَا بُلِيَتِ الْاُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيْدَ..... [1]

جب امت کی رہبری یزید جیسے شخص کے ہاتھوں میں ہو تو پھر اسلام پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے.....

---

[1]..... (مثیر الاحزان، صفحہ ۱۰) (مقتل عوالم، صفحہ ۵۳) (مقتل خوارزمی، جلد ۱، صفحہ ۱۸۵) (لھوف- سید ابن طاؤوسؒ، صفحہ ۲۰) (سخنان حسین بن علی علیہما السلام، صفحہ ۱۶)

اگر کوئی کہے کہ فقط یزید فاسق و فاجر تھا لیکن امت تو ساری دین دار، عبادت گزار اور نہایت ہی متدین تھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس وقت امام حسین علیہ السلام یہ قیام کر رہے تھے ساری امت حج کرنے میں مشغول تھی لہٰذا لوگ حج کر رہے تھے، نمازیں پڑھ رہے تھے اور باقی سارے اعمال نہایت اچھے طریقے سے انجام دے رہے تھے تو جواب یہ ہے کہ حکومتِ فاسد کے زیرِ سایہ رہنا خود ایک بے حسی ہے لہٰذا امام حسین علیہ السلام اس بے حسی کو پسند نہیں کرتے۔ امام حسین علیہ السلام تو وہ ہیں جو دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں:

لَمْ تُخْرِجْنِیْ لِرَاْفَتِکَ بِیْ وَلُطْفِکَ لِیْ وَ اِحْسَانِکَ اِلَیَّ فِیْ دَوْلَةِ أَئِمَّةِ الْکُفْرِ الَّذِیْنَ نَقَضُوْا عَهْدَکَ وَ کَذَّبُوْا رُسُلَکَ لٰکِنَّکَ اَخْرَجْتَنِیْ لِلَّذِیْ سَبَقَ لِیْ مِنَ الْهُدَی الَّذِیْ لَهٗ یَسَّرْتَنِیْ وَفِیْهِ اَنْشَاْتَنِیْ.....

یعنی اے پروردگار! تو نے اپنی مہربانی، لطف اور احسان فرماتے ہوئے مجھے کافر بادشاہوں کے دورِ حکومت میں پیدا نہیں کیا جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑا اور تیرے رسولوں کو جھٹلایا، بلکہ تو نے مجھے اس زمانے میں پیدا کیا کہ پہلے ہی سے ہدایت میرے لئے میسر کر دی تھی اور اس میں میری نشوونما کی.....

آپ علیہ السلام اس قدر حق پرست ہیں کہ آپ علیہ السلام نے اپنی ولادت کے وقت بھی حکومتِ جور کو برداشت نہیں کیا لہٰذا حکومتِ عدل میں آپ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ وہ امام حسین علیہ السلام جو حکومتِ حقّہ کریمہ

کے دور میں اپنی ولادت کو نعمتِ خدا سمجھتے ہیں تو پھر اپنی زندگی میں حکومتِ جور کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں لہٰذا فرماتے ہیں:

فَاِنِّی لَا اَرَی الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَةً وَالْحَیَاةَ مَعَ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَرَماً...... [1]

میں جانبازی اور شجاعت کی موت کو ایک سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنا میرے نزدیک ذلت اور حقارت ہے......

اس لیے کہ امام حسین علیہ السلام بے حس نہیں ہیں۔ بے حس انسان ظالموں کے ساتھ مل کے بیٹھ سکتا ہے، بے حس انسان حکومتِ جور وظلم میں بھی زندگی بسر کر لیتا ہے، بے حس انسان حق کی پائمالی کے ساتھ بھی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام یہ نہیں کہہ سکتے کہ یزید جیسا فاسق حکمران ہے تو رہے مجھے کیا؟ بلکہ امام حسین علیہ السلام کی منطق یہ تھی کہ مجھے سروکار ہے۔ حسین علیہ السلام کے ہوتے ہوئے حکومت جور برپا ہو یہ قابلِ برداشت نہیں ہے۔ لہٰذا جن کو حکومتِ حق اور حکومتِ عدل سے گھن آتی ہے وہ کم از کم اتنا ظلم نہ کریں کہ اپنے آپ کو امام حسین علیہ السلام سے منسوب کریں۔

مکتبِ حسین علیہ السلام مکتبِ حکومتِ حق ہے

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی حسینی ہو اور اس کو حکومتِ حق سے گھن آئے؟! امام حسین علیہ السلام تو حکومتِ

---

[1]...... (بحار الانوار، جلد ۴۴، صفحہ ۱۹۳) (سخنان حسین بن علی علیہم السلام از مدینہ تا کربلا)

غیر حق اور حکومتِ ظلم و جور میں نہ ولادت پسند کرتے ہیں اور نہ ہی اس میں زندگی گزارنا۔

لَا أَرَی الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَةً.....

امام علیہ السلام کے متذکرہ قول کے مطابق امام علیہ السلام ظالموں کے ساتھ زندگی بسر کرنا اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے ہیں، یہ تھی امام حسین علیہ السلام کی منطق۔ لیکن امت کی منطق اور تفکر یہ نہیں تھا، امت کہتی تھی کہ ٹھیک ہے وہ حکمران فاسد ہے لیکن ہمیں کیا؟ ہم تو ٹھیک ہیں۔ امت کی اس منطق کی وجہ امت کی بے حسی تھی، ان تمام شواہد کے بعد امام علیہ السلام کے قیام کا مقصد واضح ہو جاتا ہے، آپ علیہ السلام کے اس مقصدِ جامع میں تمام وہ اغراض شامل ہیں کہ جن سے امت کی بے حسی ختم ہو، آپ علیہ السلام چاہتے تھے کہ حق کی بابت بے حسی کا خاتمہ ہو جائے، پھر کہیں معمولی سا حق بھی نہ کچلا جائے، حق ہمیشہ سربلند رہے۔ امت جو بے حسی کے عالم میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی اس کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جائے۔

اب سوال یہ کرنا چاہیے کہ حق کی خاطر فقط امام حسین علیہ السلام نکلے، دوسرے کیوں نہیں اٹھے؟ الٹی دنیا میں الٹے سوال ہوتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے قیام کیوں کیا؟ جیسا کہ آج بھی یہی سوال کرتے ہیں کہ امام خمینیؒ نے قیام کیوں کیا؟ حالانکہ تعجب اس پر نہیں کہ امام خمینیؒ نے قیام کیوں کیا؟ تعجب اس پر ہے کہ دوسرے کیوں نہیں اٹھے؟ چپ بیٹھنا سوال برانگیز ہے۔

فلسفۂ قیام بزبانِ امام علیہ السلام

لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے آغازِ حرکت میں ہی خود فرمایا کہ میں یہ قیام کیوں کر رہا ہوں، یہ تو پوچھنے کی بات نہیں، یہ تو اتنی واضح اور برملا ہے کہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا

أَلا تَرَوْنَ اِلَی الْحَقِّ لَا یُعْمَلُ بِهِ ، وَاِلَی الْبَاطِلَ لَا یُتَنَاهٰی عَنْهُ!..... [1]

کیا دیکھتے نہیں کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل سے روکا نہیں جا رہا.....

تو کیا یہ میرے قیام کے لیے کافی نہیں؟ الا ترون (کیا تم نہیں دیکھتے) یہ لہجہ وہاں استعمال ہوتا ہے کہ جب آپ کسی کام میں مشغول ہوں مثلاً لائٹ چلی جائے اور آپ موم بتی جلانے میں مشغول ہوں تو کوئی آ کر آپ سے پوچھے کہ موم بتی کیوں جلا رہے ہو؟ اب آپ اسے کیا جواب دیں گے؟ یہی جواب دیں گے کیا اندھے ہو؟ نہیں دیکھتے کہ لائٹ چلی گئی ہے؟!

اسی طرح امام حسین علیہ السلام نے اُس ظلمانی اور تاریک دور میں جب سب بے حسی کا شکار تھے شمعِ حق جلائی تو بعض کوڑھ دلوں نے یہی پوچھا کہ یہ شمعِ ہدایت کیوں جلا رہے ہو؟ لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے یہی جواب دیا:

أَلا تَرَوْنَ اِلَی الْحَقِّ لَا یُعْمَلُ بِهِ.....

تمہاری آنکھوں میں کیا آیا ہوا ہے، دیکھتے نہیں کہ لوگ حق سے بے اعتنا اور بے حس ہو گئے ہیں۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے، حق سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ تو کون حق سے بے اعتنا ہو گیا تھا؟ کونسا حکمران بے حس ہو چکا تھا؟ اس کی تو بات ہی کیا، بلکہ بے حسی وباء بن گئی تھی، اگر صرف حکمران فاسد ہو جاتا تو اس کو الگ رکھا جا سکتا تھا تا کہ دوسروں کو یہ چھوت کا مرض نہ لگ جائے

---

[1]..... (حیاۃ الامام الحسین بن علی علیہما السلام دراسۃ وتحلیل) (الملہوف علی قتلی الطفوف)

لیکن جب وہ وباء بن جائے تو پھر اس کا علاج کچھ اور ہے یعنی اسلام کی نیم صدی گزرنے کے بعد یہ حال ہوا کہ بے حسی وباء بن گئی حالانکہ یہی اسلام حق کی طرف اُکساتا ہے، اسلام کہتا ہے کہ حق کا دفاع کرو، حق کی خاطر کٹ مرو، حق کے لیے اپنی جان سے بھی گزر جاؤ لیکن بے اعتنائی اور بے حسی اتنی بڑھ گئی کہ اسلام کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے سامنے حق پائمال ہوتا ہے لیکن اعتنا نہیں کرتے لہٰذا فرمایا:

وَ أنّی لَمْ أخْرُجْ أشِراً، وَ لا بَطِراً، وَ لا مُفْسِداً، وَ لا ظالِماً، وَ اِنَّما خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلاحِ فِی اُمَّةِ جَدّی، اُریدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَ اَنْهی عَنِ الْمُنْکَرِوَ اَسیرَ بِسیرَةِ جَدّی وَ اَبی......[1]

میرا نکلنا نہ خود پسندی اور تفریح کی غرض سے ہے اور نہ فساد اور ظلم وستم میرا مقصد ہے، میں تو صرف اس لئے نکلا ہوں کہ اپنے ناناؐ کی امت کی اصلاح کروں، میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دوں اور یوں اپنے ناناؐ اور اپنے والد گرامیؑ کی سیرت کی پیروی کروں......

اصلاح ہمیشہ اس کی ہوتی ہے جو فاسد ہو جائے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک پنہانی اور نامرئی فساد تھا جو امت کو دامن گیر ہوا تھا اور کسی کو نظر نہیں آرہا تھا، جس کے لیے امام حسین علیہ السلام جیسے انسان کی باریک بین نگاہیں چاہیئے تھیں۔ وہ فساد یہ تھا کہ لوگ حق کی طرف بے اعتنا اور لاپرواہ ہو چکے تھے، اس لاپروائی میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ امام حسینؑ نے لوگوں کو مدینہ میں دعوت دی کہ آؤ

[1]......(بحار الانوار، جلد۴۴، صفحہ ۳۲۸)(مقتل خوارزمی، جلد۱، صفحہ ۱۸۸)(سخنان حسین بن علی علیہم السلام از مدینہ تا کربلا)

ہمارے ساتھ چلولیکن سب لوگ نہیں آئے، پھر مکہ میں اہلِ حج کو دعوت دی لیکن ساتھ نہیں دیا۔نمازیں اور حج دلیل نہیں ہوتے کہ نمازی اور حاجی انسان حق پرست بھی ہے کیونکہ امام حسین علیہ السلام نے اہلِ حج کو حالتِ احرام میں بلایا کہ میرے ساتھ آؤ،اس وباء کو مٹانا ہے لیکن دعوتِ امام علیہ السلام کا کتنا اثر ہوا؟ حج کے لبادے میں، احرام کے لبادے میں حق سے بے اعتنائی برتی گئی، بے حس قوم حج میں مشغول رہی اور امامِ حق سے کہا کہ آپ جایئے ابھی ہم حج کرنے میں مشغول ہیں۔اگر لوگوں کی یہ بے حسی اسی طرح جاری رہتی تو ہلاکت عنقریب تھی لیکن امام حسین علیہ السلام سفینۂ نجات ہیں اور آپ علیہ السلام نے امت کو نجات دینی ہے۔

قیامِ امام حسین علیہ السلام، احساس کے ساکن سمندر میں تلاطم

اگر کوئی آپ کے سامنے بے حس اور مدہوش ہو جائے اور آپ سے کہا جائے کہ اس کو نجات دو تو آپ کیا کریں گے؟ سب سے پہلا یہ کام کریں گے کہ اس کو ہوش میں لائیں گے، اس کے حواس کو بیدار کریں گے۔اگر ایک معاشرہ، سماج اور ایک امت بے ہوش و مدہوش اور بے حس ہو جائے اور سفینۂ نجات اس کو نجات دینے کے لیے آئے تو سب سے پہلے یہی کام کریں گے کہ اس کو ہوش میں لائیں گے، اس کی بے حسی کو ختم کر کے اس کے اندر احساس پیدا کریں گے۔

معمولی بے حسی میں احساس پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن جب نشہ بہت گہرا ہو جائے اور حق سے بے حسی بڑھ جائے تو اس کے تدارک کے لئے بھی بڑے اقدام کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے ان کو بیدار اور ہوشیار کرنا چاہا، یہ بے حسی کا نشہ تلخ اقدام اٹھانے سے اترتا ہے، اس کے لیے سخت ترین دوا تجویز کی جاتی ہے، پیکرِ امت کے لیے سخت ترین نسخہ لکھا جاتا ہے، اس کے لیے انہیں جھنجھوڑنے

قیامِ امام حسین علیہ السلام، احساس کے ساکن سمندر میں تلاطم

اور جھٹکنے کی ضرورت ہوتی ہے، اُکسانے اور ابھارنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے کہ یہ بے حسی آج کی پیداوار نہیں بلکہ اس کی جڑیں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے ہیں، قومِ نوحؑ بھی بے حس تھی۔

امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں بھی یہ نشہ وباء بن گیا تھا اور امت کی رگ رگ میں گھس گیا تھا، لہٰذا اس بے حس امت کو بیدار کرنا تھا۔ بے حس امت جنگجوؤں سے، اسلحے اور لشکروں سے بیدار نہیں ہوتی، اسلحوں کے ذریعے زمینیں لی جاسکتی ہیں لیکن ضمیروں کو نہیں جھنجھوڑا جا سکتا۔ لشکروں سے اقتدار پر قبضہ کیا جا سکتا ہے لیکن اقدار کی بابت ضمیروں کو بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ امام حسین علیہ السلام کو اقتدار نہیں چاہیے، حسین علیہ السلام کو اقدار چاہئیں، امام حسین علیہ السلام کو زندہ ضمیر چاہیے تھے۔ لہٰذا اس بے حسی کے طلسم کو توڑنا ہے لیکن بے حسی کا جادو کیسے ٹوٹے گا؟ ایک تلاطم اور طوفان سے ٹوٹے گا، اس ساکت اور پرسکون سمندر میں ایک تلاطم ایجاد کرنے کی ضرورت ہے اور امت میں وہ تلاطم امام حسین علیہ السلام کے علاوہ کوئی بھی ایجاد نہیں کرسکتا۔

اگر پانی کے اندر کنکری پھینکی جائے تو اس سے ایک دائرہ نما موج چاروں طرف پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ موج تھوڑی دور جا کر ختم ہو جاتی ہے لیکن سمندر میں چھوٹی سی کنکری کے پھینکنے سے موج نہیں اٹھتی بلکہ سمندروں میں موج پیدا کرنے کے لیے بہت بڑی چٹان، بہت بڑا پہاڑ پھینکنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا امت کے اس خاموش سمندر میں جب تک امام حسین علیہ السلام جیسے عظیم انسان نہیں کودتے امت کے اس خاموش سمندر میں کبھی موج نہیں اٹھے گی۔ چنانچہ امام حسین علیہ السلام نے قیامت تک کے لئے ایک موج ایجاد کی جو چہار سو پھیل رہی ہے، اب یہ قیامت تک بے حس ضمیروں کو جھنجھوڑے گی۔

امام حسین علیہ السلام نے تمام انبیاء علیہم السلام کی محنتوں کو بچالیا اس لئے کہ وارثِ انبیاءؑ ہیں۔ آپ علیہ السلام نے

انبیاء علیہم السلام کی وہ بنیادی مشکل حل کی کہ جس کے حل کے لیے انبیاءؑ مبعوث ہوئے تھے، امام حسین علیہ السلام نے اپنے مورث کے سارے سرمایہ کو نجات دی۔ بے شک امام حسین علیہ السلام سفینۂ نجات ہیں، نہ فقط گناہگاروں کے لیے، نہ فقط اس امت کے لیے بلکہ انبیاءؑ کی زحمتوں اور پوری بشریت کے لئے سفینۂ نجات ہیں۔[1]

ب: امامت کے تقاضے

فلسفۂ قیامِ امام حسین علیہ السلام کو "امامت و امت" کے عنوان سے بھی بیان کر سکتے ہیں، یہاں پر

---

[1]...... علامہ اقبالؒ رموزِ بیخودی میں در معنی حریت اسلامیہ و سر حادثۂ کربلا فرماتے ہیں:

عزم او چون کوهساران استوار — پایدار و تند سیر و کامگار
تیغ بهر عزت دین است و بس — مقصد او حفظ آئین است و بس
ما سوی الله را مسلمان بنده نیست — پیش فرعونی سرش افکنده نیست
خون او تفسیر این اسرار کرد — ملت خوابیده را بیدار کرد

ترجمہ: آپ کا عزم پہاڑ کی طرح محکم و استوار تھا، بندہ حق کی تلوار صرف آبروئے دین کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے اور اس کا مقصد حفظ آئین اسلام ہے، مسلمان اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرتا، اس کا سر کسی فرعون و نمرود کے آگے نہیں جھک سکتا، امام حسین علیہ السلام نے اپنا لہو دے کر ان اسرار کی تفسیر فرمائی اور آپ علیہ السلام کی قربانی ملتِ خوابیدہ کی بیداری کا سامان کر گئی۔

امامت کے تقاضے

بھی یہی کہہ سکتے ہیں کہ نعوذ باللہ اگر واقعۂ کربلا کے متعلق حضرت امام حسین علیہ السلام کا ایک جملہ بھی ہمارے پاس نہ ہوتا تو بھی یہی عنوانِ امامت آپ کے مقصد کے لیے کافی تھا۔

اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم امامت کو سمجھیں، امامت کے تقاضوں کو جان لیں، اگر ہم امامت کو صحیح طور سے سمجھ سکے تو واقعۂ کربلا کا فلسفہ اور مقصود خود بخود معلوم ہو جائے گا، اس لیے کہ یہ ایک امامانہ قیام تھا، امامِ حق نے یہ قیام فرمایا ہے، یہ ایک عام انسان کا قیام نہیں تھا۔ امامت ایک پورا نظام ہے جو خداوند متعال نے انسانوں کی ہدایت اور رشد و ترقی کے لیے مقرر کیا ہے۔

علامہ طباطبائیؒ کے شاگرد ''ہنری کاربن'' جو دنیائے غرب کے علمی حلقوں میں بہت مشہور ہیں، فرانس کے اسکالرز (Scholars) میں نوبل انعام یافتہ بھی ہیں، بہت ہی برجستہ اور ممتاز شخصیت ہیں جو چند سال پہلے فوت ہو گئے ہیں۔ وہ جب علامہ طباطبائیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہا کہ ''میں نے جو کچھ آپ سے سیکھا اور یورپ کی یونیورسٹیز (Universities) اور علمی مراکز میں اسکالرز کے سامنے تشیع کا تصور پیش کیا کہ یہ بھی اسلام کا ایک حصہ ہے، جبکہ اس سے پہلے انھیں تشیع کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں، جب میں نے ان کے سامنے امامت کا تصور پیش کیا تو ان کے منہ کھل گئے، کہا کہ اس قدر معقول توجیہہ، اس قدر حقیقی کائنات شناسی، یہ رابطہ اور کڑی جو تشیع نے خدا اور کائنات کے درمیان ملائی ہے آج تک کوئی تفکر اس قسم کی کڑی نہیں ملا سکا، تشیع کس قدر پاکیزہ، معقول اور نورانی مذہب ہے۔ سراسر نور ہی نور ہے، انسان ذرا اس کو جھانک کر دیکھے تو سوائے نور کے کچھ بھی نہیں ملے گا۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ ......[1]

خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لا چکے کہ انہیں (گمراہی کی) تاریکیوں سے نکال کر (ہدایت کی) روشنی میں لاتا ہے......

ولایت، ظلمات سے نکالنے اور نور کی طرف لانے کا نام ہے۔

شیعت، ولایت کا مذہب ہے

امامت بھی وہی ولایت ہے، ولایت و امامت کے بغیر ظلمات سے نکل کر نور کی طرف جانا ممکن ہی نہیں۔ اب یہ سوال کہ وہ کونسی چیز تھی جو باعث بنی کہ امام حسین علیہ السلام نے یہ راستہ انتخاب کیا اور یہ خونین قیام فرمایا؟ جواب یہی ہے کہ وہی عنوان اور منصب جس سے امام حسین علیہ السلام کو یاد کرتے ہیں، جو ہمارے مذہب کی وجہ تسمیہ بھی ہے، ہمارے مذہب کا نام ہی مذہبِ امامیہ ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے اور بھی بہت سے عناوین ہیں، نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فرزند علی علیہ السلام، فرزند فاطمہ علیہا السلام، جنت کے جوانوں کے سردار، لیکن عنوانِ امامت کو ان عناوین میں سے کلیدی حیثیت حاصل ہے مثلاً ایک کمرے میں کوئی شخص بیٹھا ہوا ہو تو اس کے کئی عناوین ہو سکتے ہیں جیسے کسی کا باپ ہے، کسی کا بیٹا ہے، دوست، فقیہ و تاجر لیکن ممکن ہے اس کے بارے میں یہ سب عناوین آپ کو پہلے سے معلوم ہوں، اگر آپ کو بتا دیا جائے کہ یہ کمرے میں بیٹھا ہوا شخص معلم ہے اور لوگوں سے محو گفتگو ہے تو سب سے پہلے جو چیز ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ حتماً کسی

---

[1]...... سورۂ بقرہ، آیہ ۲۵۷

تعلیمی میدان کے حوالہ سے گفتگو ہوگی، کوئی علمی گفتگو ہوگی۔ اب اگر چہ جزئیات کا علم نہیں لیکن محورِ گفتگو معلوم ہوگیا، اسی طرح عنوانِ امام بہت ہی بلند اور عالی عنوان ہے اور اس کے اندر سب کچھ موجود ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ امامؑ نے یہ قیام کیا تو اس سے محورِ قیام معلوم ہوتا ہے، اگر چہ ہم عادتاً امام امام کہتے ہیں لیکن اس عنوان کے اصلی معنیٰ اور مفہوم کی طرف توجہ نہیں کرتے، جیسا کہ ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، حالانکہ اس کے معنیٰ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، "**السلام علیکم**" یعنی خدا کی طرف سے تجھ پر سلامتی ہو۔ میری طرف سے تمہارے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے، میری طرف سے تیرا مال، تیری ناموس، تیری جان کی سلامتی اور امان ہے اور خدا کی طرف سے بھی تجھ پر سلامتی ہو، یہ بہت بڑی دعا ہے اگر اسے توجہ اور نیت کے ساتھ ادا کریں۔ اسی طرح درود بھی ہم عادتاً پڑھتے ہیں، اگر توجہ کے ساتھ پڑھیں تو اس سے بڑا کلمہ اور کوئی نہیں۔ اسی طرح بعض عادت کے طور پر کہتے ہیں "**استغفر اللّٰہ ربی و اتوب الیہ**"، امیر المومنین علی علیہ السلام کے سامنے کسی شخص نے عادتاً کہہ دیا **استغفر اللّٰہ**، تو یہ بات آپ کو بہت بُری لگی، فرمایا:

ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ اَتَدْرِیْ مَا الْاِسْتِغْفَارُ؟.....[1]

ترجمہ: تمہاری ماں تمہارا سوگ منائے، کچھ معلوم بھی ہے کہ استغفار کیا ہے؟

اسی طرح یہ عنوانِ امام بھی ہماری زبانوں پر بہت آتا ہے، یہاں تک کہ لوگ بھی ہمیں امامیہ کہنے لگے۔

---

[1]..... نہج البلاغہ، کلماتِ حکمت، حکمت نمبر ۴۱۷

امام اور امامت دونوں کی معرفت ضروری ہے

یہ قیام ایک امام کا قیام ہے، یہ جملہ خود بتاتا ہے کہ اس قیام کی نوعیت کیا تھی؟ اگر ہم امامت کو سمجھ سکیں تو ساری حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے، ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ امام کون ہے، لیکن امامت کیا ہوتی ہے؟! یہ جاننا بہت مہم ہے۔ امامت کو سمجھے بغیر امام کو نہیں سمجھ سکتے، امام کو پہچاننا ہے تو امامت کے ذریعے سے ہی پہچان سکتے ہیں۔ امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

أُعْرِفُوا اللّٰهَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلَ بِالرِّسَالَةِ وَاُولِی الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ......[1]

اللہ کی معرفت اللہ کے ذریعے حاصل کرو اور رسول کو اس کی رسالت کے ذریعے پہچانو اور اولی الامر کو نیکی اور عدل و احسان کے ذریعے پہچانو۔

حالانکہ امام علیہ السلام کی معرفت حاصل کرنا سب کے لیے لازمی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

مَنْ مَاتَ لَا يَعْرِفُ اِمَامَهُ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً......[2]

جو اس حالت میں مر جائے کہ اپنے امام کو نہیں پہچانتا ہو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

---

[1]......(الکافی - الکلینیؒ، جلد۱، صفحہ۱۱۸) (تفسیر نور الثقلین) (میزان الحکمۃ - الریشہری، جلد۶، صفحہ۱۷۴)

[2]......(الکافی، جلد۱، صفحہ۳۷۷) (التفسیر والمفسرون) (الفصول المہمۃ فی أصول الأئمۃ - الحر العاملیؒ، جلد۱، صفحہ۴۰۵)

نبی کے ہوتے ہوئے یا نبی کے بعد بھی امامت کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ لوگوں کو اس نظام کے اندر لا کر مقصدِ خلقت تک پہنچائیں۔ اقدار کے دفاع کے نظام کو امامت کہتے ہیں۔

امام وہ ہوتا ہے جو اقدارِ دین اور اصل دین کی حفاظت کرنے والا ہو۔ امامت خواہ معصوم کی ہو یا غیر معصوم کی ہو دونوں صورتوں میں اس کا ذمہ دین کی حفاظت کرنا ہے۔ غیر معصوم کی امامت سے مراد معصوم کے نائب کی امامت ہے۔ جیسے مالک اشترؒ، محمدؒ بن ابی بکر وغیرہ کی امامت جو معصوم کی نیابت کی وجہ سے ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ غیر معصوم، معصوم کا نائب نہیں بن سکتا ہے حالانکہ یہ بہت بڑی غلطی ہے، یہ عیناً اسی طرح ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ

هَلَکَ فِیَّ رُجُلَانِ: مُحِبٌّ غَالٍ وَ مُبْغِضٍ قَالٍ۔[1]

میرے بارے میں دو قسم کے لوگ تباہ و برباد ہوئے: ایک وہ چاہنے والا جو حد سے بڑھ جائے اور ایک وہ دشمنی رکھنے والا جو عداوت رکھے۔

قالی یعنی جو پیچھے رہ گیا، غالی یعنی جو آگے بڑھ جاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے بھی بڑا دین دار وہ ہے کہ جس کا کہنا ہے کہ غیر معصوم، معصوم کا نائب نہیں ہوسکتا ہے۔ حالانکہ حضرت علی علیہ السلام نے عملاً یہ کام کر کے بھی دکھایا ہے، غیر معصوم افراد اپنے نائب کے طور پر بھیجے ہیں، یہ نظامِ امامت ایسا ہی ہے کہ غیر معصوم افراد کی نیابت سے چلتا ہے۔ لیکن جب غیر معصوم کو اپنا نائب بنایا تو ساتھ رکن امامت کا بھی ذکر کیا۔ امامت کے متعلق حضرت امام رضا علیہ السلام کی ایک حدیث ہے جو زیادہ مفصّل ہے اس کے چند جملے

۱..... نہج البلاغہ، حکمت ۱۱۷

یہاں پر نقل کرتے ہیں:

ان الامامة هی منزلة الأنبياء ، وارث الأوصياء. ان الامامة خلافة الله وخلافة الرسول صلى الله عليه وآله ومقام أمير المؤمنين ، وميراث الحسن والحسين عليهم السلام .ان الامامة زمام الدين ، ونظام المسلمين ، وصلاح الدنيا وعز المؤمنين .ان الامامة أسُّ الاسلام النامی ، وفرعه السامی .

بالامام تمام الصلاة والزكاة والصيام والحج والجهاد،وتوفير الفء والصدقات ، وامضاء الحدود والأحكام ، ومنع الثغور والأطراف .

الامام يحل حلال الله ، ويحرم حرام الله ، ويقيم حدود الله ، ويذب عن دين الله ، ويدعو الى سبيل ربه بالحكمة والموعظة الحسنة ، والحجة البالغة .....

فمن ذا الّذی يبلغ بمعرفة الامام أو يمكنه اختياره؟هيهات هيهات ضلّت العقول، وتاهت الحلوم، وحارت الألباب، وحسرت العيون، وتصاغرت العظماء، وتحيّرت الحكماء، وتقاصرت الحلماء، وحصرت الخطباء،

وجهلت الألبّاء، وكلّت الشعراء، وعجزت الادباء، وعييت البلغاء عن وصف شأن من شأنه أو فضيلة من فضائله فأقرّت بالعجز والتقصير.

وكيف يوصف أو ينعت بكنهه أو يفهم شيء من أمره أو يوجد من يقوم مقامه ويغني غنائه؟، كيف وأنّى وهو بحيث النجم من أيدى المتناولين ووصف الواصفين؟ فأين الاختيار من هذا؟ وأين العقول عن هذا؟ وأين يوجد مثل هذا؟

أظنّوا أنّ ذلک يوجد فی غير آل الرسول صلّى اللّٰه عليهم كذبتهم واللّٰه أنفسهم......

عالم بالسياسة، مفروض الطاعة قائمٌ بأمر اللّٰه، ناصح لعباد اللّٰه، حافظ لدين اللّٰه......[1]

امامت انبیاء کی منزلت اور اوصیاء کا ارث ہے، امامت خلافۃ اللہ اور خلافۃ الرّسول ہے، امامت امیر المومنین علیہ السلام کا مقام اور حسن علیہ السلام و حسین علیہ السلام کی میراث ہے۔ امامت دین کی باگ ڈور، مسلمانوں کا نظام، دنیا کی درستی

امام اور امامت دونوں کی معرفت ضروری ہے

---

[1]......(اصولِ کافی، باب حجت، جلد۱، صفحہ ۲۰۲-۲۰۰، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، ۱۳۴۳ھ)

(کلمۃ الامام الرضا علیہ السلام)

اور مومنوں کی عزت ہے۔ امامت اسلام کی رشد و نمو والی بنیاد اور اس کی بلند شاخ ہے۔

امام کے ذریعے سے ہی نماز، روزہ، زکات، حج اور جہاد کامل ہوتے ہیں اور فئی اور صدقات بڑھ جاتے ہیں اور حدود و احکام نافذ ہوتے ہیں، امام کے ذریعے سے ہی سرحدوں اور اطراف کی حفاظت ہوتی ہے۔

امام حلالِ خدا کو حلال اور حرامِ خدا کو حرام قرار دیتا ہے، حدودِ الٰہی کو قائم اور دینِ خدا کا دفاع کرتا ہے، حکمت، مواعظِ حسنہ اور حجت کے ذریعے اللہ کی راہ کی طرف بلاتا ہے.....

پس امام کی معرفت تک کون پہنچ سکتا ہے؟ کس کی قدرت میں ہے کہ وہ اپنے لیے ایسا امام اختیار کرے؟ ہرگز نہیں، یہ بہت دور کی بات ہے، امام کے فضائل میں سے کسی فضیلت اور شان کو بیان کرنے سے صاحبان عقل اور عقل حیران، صبر تمام، آنکھیں تھکی ہوئیں، بڑے بڑے لوگ بہت چھوٹے، حکماء حیران، بردبار لوگ اور خطباء عاجز، تیز فہم لوگ جاہل، شعراء گونگے، ادیب اور فصیح و بلیغ لوگ بھی عاجز ہیں۔

امام کا وصف کیسے بیان کیا جائے یا اس کی حقیقت کی تعریف کیسے کی جائے یا امامت کے امر میں سے کوئی چیز سمجھی جائے یا کسی ایسے شخص کو

پالیا جائے جو اس کے مقام پر بیٹھ سکے اور وہ امام کی طرح ہی ہر چیز میں غنی ہو کیسے ہو سکتا ہے؟! اور کیسے اس کی توصیف ممکن ہے جو لوگوں کے درمیان ستارے کی مانند ہے؟! ایسے امام کو چننا لوگوں کے بس میں نہیں اور عقلوں کی رسائی ان تک ممکن نہیں، ایسے امام کہاں ہیں؟

کیا تمہارا خیال یہ ہے ایسا امام خاندان رسالت سے باہر کہیں موجود ہے؟ خدا کی قسم وہ اپنے آپ کو جھٹلاتے ہیں.....

امام سیاست کا عالم ہوتا ہے، اس کی اطاعت سب پر فرض ہے، امام خدا کے امر کو قائم کرنے والا، خدا کے بندوں کو نصیحت کرنے والا اور دینِ خدا کی حفاظت کرنے والا ہے.....

معصوم خدا کی طرف سے منسوب ہے اور غیر معصوم، معصوم علیہ السلام کی طرف سے منسوب ہے، معصوم مظہر ولایت خدا ہے تو غیر معصوم بھی ایک واسطہ کے ذریعے سے مظہر ولایتِ معصوم علیہ السلام ہے۔ شرطِ اساسی یہی ہے کہ وہ محافظ دین ہو، لہٰذا جب امام حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی غیبت کا زمانہ شروع ہوا تو سلسلۂ ولایت کو نیابت کی صورت میں جاری کیا اور ابھی تک یہی سلسلہ جاری ہے۔ اس نیابتِ عامہ کے لیے بھی شرائط ہیں، ان میں سب سے اہم شرط حفاظتِ دین ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِناً لِنَفْسِهِ حَافِظاً لِدِيْنِهِ مُخَالِفاً عَلٰى هَوَاهُ مُطِيْعاً لِأَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ يُقَلِّدُوْهُ وَ ذَالِكَ لَا

يَكُوْنُ اِلَّا بَعْضُ فُقَهَاءِ الشِّيْعَةِ لَا كُلُّهُمْ..... [1]

"لوگوں کو چاہئے کہ فقہاء (یعنی احکامِ شریعت کو تفصیل و تحقیق کے ساتھ جاننے والے مجتہدین) میں سے جو شخص اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہو، اپنے دین کی حفاظت کرتا ہو، اپنی نفسانی خواہشات کا غلام نہ ہو اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کرتا ہو اس کی تقلید کریں۔" اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا، "یہ اوصاف معدودے چند شیعہ فقہاء میں ہیں، سب میں نہیں۔"

پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے نفس کو کنٹرول کرنے والا ہو یعنی عدالت کے مرتبہ پر فائز ہوتا کہ اس سے گناہ سرزد نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مجموعۂ اقدار کی حفاظت کرنے والا ہو، ورنہ امامت کا حق ادا نہیں کرسکتا، جس سے اپنے گھر کا نظام نہ چل سکے، جو اپنے چند ساتھیوں کو کنٹرول نہ کرسکتا ہو تو نظامِ اقدار کو کیسے برپا کرے گا۔ نظامِ اقدار کو برپا کرنے اور اس کے مقابلے میں منفی اقدار کو نیست و نابود کرنے کے لئے شرطِ اساسی یہی ہے کہ وہ محافظِ دین ہو۔ اگر کسی معاشرے میں اقدار پائمال ہونا شروع ہو جائیں، ساری اسلامی اقدار مٹ رہی ہوں اور ان سے یہ کہا جائے کہ یہ اقدار اور یہ اقدار کی پائمالی! آیئے بسم اللہ آپ ان کا دفاع کریں، تو کہے گا کہ ہمیں کیا؟ ہم تو محفوظ ہیں، ہمارے ہاں تو ابھی تک دشمن نہیں آیا، تو کیا ایسا شخص امام ہوسکتا ہے؟

---

[1]..... احتجاجِ طبرسی، جلد۲، صفحہ۲۶۳

لفظِ امام کی وضاحت

مفہومِ امامت سے واقعۂ کربلا کھل کر سامنے آ جاتا ہے، امام یعنی پیشوا، پیشرو آگے چلنے والا۔ اس کے اندر دو مفہوم ہیں، ''پیش'' یعنی آگے، ''رو'' رفتن سے ہے یعنی چلنا، پیشرو یعنی آگے چلنے والا۔ لہٰذا جامد، ساکت اور خاموش بیٹھا ہوا شخص امام نہیں ہوسکتا۔

عربوں میں ایک رواج ہے کہ بعض اوقات وہ دل داری کے لیے بھی نام رکھتے ہیں۔ جیسے ہم جس شخص کی ایک آنکھ نہ ہو تو اسے کانا، جس کی دونوں آنکھیں نہ ہو اس کو نابینا اور جس کی ٹانگ نہ ہو اس کو لنگڑا کہتے ہیں۔ یہ ایسے الفاظ ہیں کہ جن سے اس شخص کا دل دُکھتا ہے جو اس حادثے سے دوچار ہوا ہو، عرب ایسا نہیں کرتے بلکہ وہ نابینا کو ابوبصیر یعنی بینائی کا باپ کہتے ہیں، اسی طرح سانپ ڈسے کو سلیم کہتے ہیں یعنی بالکل سالم ہے۔ یہ اس لیے کرتے ہیں تا کہ ان جملوں سے کم از کم ان کے دل خوش ہو جائیں، شاید ہم نے عربوں سے سیکھا کہ دلداری کے لیے بعض کلمات استعمال کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ وہ شخص جو مسجد سے بالکل باہر جاتا ہی نہیں، جو ایک قدم آگے نہ اٹھائے تو ہم اس کو امام کہتے ہیں، یہ اس کی دلداری کے لیے کہتے ہیں ورنہ برف کے تودہ کو کہ جو خود بھی جما ہوا ہے اور پورا ماحول بھی برفانی بنا دیا ہے، جس میں ذرہ برابر حرکت نہیں ہے اسے پیر و یا امام کہہ دینا ایسے ہے جیسے عرب نابینا کو ابوبصیر کہتے ہیں۔ شاید یہ ادب ہم نے عربوں سے سیکھا ہے ورنہ اگر اپنا کلچر (Culture) ہوتا تو ہم نابینا کو نابینا ہی کہہ دیتے ہیں، رُکے ہوئے کو رُکا ہوا ہی کہتے ہیں، لہٰذا امام وہی ہوتا ہے کہ جس میں حرکت ہو، جو حق کے دفاع کے لیے سب سے آگے ہو۔

امام، محافظِ اقدارِ دین

امام وہ ہوتا ہے جو اقدار کو پائمال ہوتے ہوئے ہرگز نہیں دیکھ سکتا، یہاں سے بہت سے سوالوں کا جواب ملتا ہے مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ جب امام حسین علیہ السلام کو علم تھا کہ اس معرکہ میں مارا جاؤں گا، پھر کیوں گئے؟ جبکہ جان بچانا واجب ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ، آیہ ۱۹۵ میں ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ.....

اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو.....

تو کیا یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں تھا؟ اگر ایک طرف اقدار پائمال ہو رہی ہوں اور امامِ حق انہیں بچانے کے لیے اقدام کرے اور اپنی جان سے گزر جائے تو کیا یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے؟ اس کے لئے مثال یہ ہے کہ بعض شخصیات اپنی حفاظت کے لیے اپنے ساتھ گارڈز اور محافظ رکھتے ہیں تا کہ بوقتِ ضرورت ان کی حفاظت کر سکیں۔ اگر اتفاقاً اس شخصیت پر حملہ ہو جائے اور یہ محافظ آرام سے کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا ہو تو آپ اس سے کہیں گے کہ بھائی کیا کر رہے ہو؟ جس کی حفاظت پر تجھے مامور کیا تھا اس پر حملہ ہو رہا ہے، تم کوئی حرکت کیوں نہیں کرتے؟ اگر وہ کہے کہ

وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ.....

کہ اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالنا تو آپ تعجب کریں گے کہ یہ کیا جواب ہے؟ یہ آیت محافظوں کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ تو محفوظ لوگوں کے لیے ہے۔ بات بگاڑ کے کہاں سے کہاں لے گئے؟ این الثّریٰ والثریا؟ این التراب و رب الأرباب..... کہاں خاک اور کہاں ثریا، کہاں مٹی اور کہاں رب الارباب..... بقول اقبالؒ

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کیلئے......[1]

یہ آیت تو محفوظ لوگوں کے لیے ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو لیکن تم تو محفوظ نہیں ہو بلکہ محافظ ہو، محافظ کا معنٰی یہی ہے کہ شیر بن جاؤ ورنہ گولی اس کو لگے گی کہ جس کی حفاظت کر رہے ہو اور اس کام کو حفاظت نہیں بلکہ خیانت کہتے ہیں۔ اسی طرح جب اقدار پائمال ہو رہی ہوں تو جو محافظِ اقدار ہو کیا وہ یہ کہے گا کہ مجھے کیا؟ لہٰذا جب تک کوئی محافظِ اقدار نہیں بن سکتا وہ امام نہیں ہو سکتا، کیا کبھی تماشائی گارڈ بھی دیکھا ہے؟ جو کسی کی حفاظت پر مامور ہو اور اسے چھوڑ کر اپنی حفاظت کی فکر میں ہو تو وہ محافظ نہیں بلکہ خائن ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی گارڈ اپنی ذمہ داری کو بجالاتے ہوئے دفاع کرے، جس کی حفاظت پر مامور ہو اس کو بچا کر خود اپنے سینے پر گولی لے لے اور پھر اس سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا ہوا؟ تم کیوں اس میں کود پڑے؟ تو وہ یہی جواب دے گا کہ یہ میری ذمہ داری تھی۔

نظامِ اقدار کو بچانا امام کی ذمہ داری ہے۔ کیا کبھی دیکھا ہے کہ جب کسی شخص کو کسی شخصیت کی حفاظت پر مامور کیا جاتا ہے تو کیا بعد میں اس کو خط لکھا جاتا ہے کہ اس کی حفاظت کرو اور وہ بھی خط ملنے کا منتظر بیٹھا رہتا ہے؟ کیا محافظ دعوتوں کا منتظر بیٹھا رہتا ہے یا اپنے موقع پر مناسب کارروائی کر کے دکھاتا ہے؟ وہ محافظ نہیں ہوتا جو خط یا دعوت کے انتظار میں بیٹھا ہو، محافظ کو حکم ماموریت ملتا ہے کہ دین اور اس کی اقدار کو بچانا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ محافظِ اقدار مدینہ میں بیٹھ جائے اور اہلِ کوفہ کے خطوط اور

---

[1]......بالِ جبرئیل، غزل ۲۶، صفحہ ۵۶

دعوت کا منتظر رہے کہ جب ان کی طرف سے دعوت آئے گی تب ہی اقدار کی حفاظت کروں گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کوفہ والوں کو جلدی اقدار سمجھ میں آ گئیں۔ وہ کیسے امام ہو سکتا ہے کہ جس سے زیادہ کوفی اقدار کو سمجھتے ہوں؟ یہ امامت سے دوری ہے۔

اگرچہ کوفے والوں نے خط لکھے تو ان میں سے بعض کو یہ نظر آیا تھا کہ اب اقدار خطرے میں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے کسی اور کو خط کیوں نہیں لکھے؟ اس زمانے میں تو بڑے بڑے صحابی اور صحابی زادے موجود تھے۔ اس لیے کہ کسی اور نے عمل شروع ہی نہیں کیا تھا، خط اس کو لکھے جاتے ہیں کہ جو میدانِ عمل میں ہو۔ یعنی کوفہ والوں کا خط لکھنا ردِ عمل تھا، چونکہ انہیں معلوم ہوا تھا کہ امام حسین علیہ السلام نے خروج کیا ہے لہٰذا کوفہ کے خطوط کے بغیر مدینہ سے نکلے۔ کوفہ والوں نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اگرچہ اس پر بھی پابند نہ رہے، اس طرح نہیں تھا کہ کوفے والے پیش قدم تھے ورنہ کوفی تو بڑے عظیم لوگ ہو جائیں گے۔ اگر اتنا شعور کوفیوں میں آ جائے کہ امام کو قیام پر اکسائیں اور ان کے کہنے پر امام بھی اٹھ کھڑے ہوں تو پھر امامت تو کوفیوں کی ہو جائے گی۔ لہٰذا امام کا کام یہی ہوتا ہے کہ جب اقدار خطرے میں ہوں تو اٹھ کر ان کا دفاع کرتا ہے۔

مفتی اور امام میں فرق یہی ہوتا ہے کہ مفتی کا کام صرف فتویٰ دینا ہے، حالانکہ فتویٰ دینے اور دین کی حفاظت کرنے میں بہت فرق ہے، لہٰذا ایک مقام پر حضرت علی علیہ السلام نے افسوس سے فرمایا کہ

اَنْزَلَنِیَ الدَّھْرُ...... [1]

زمانے نے مجھے پست سمجھا۔ اتنی جفا اور ستم کہ لوگ علی علیہ السلام کا معاویہ سے مقایسہ کرنے لگے،

---

[1]...... (شرح نہج البلاغۃ - الحائری) (الامام علی علیہ السلام سیرتہ وقیادتہ)

ایک اور جگہ یہ ہے کہ جب علی علیہ السلام کو ایک کٹہرے میں لا کر بٹھا دیا تو فرمایا:

فَیَا لَلّٰہِ وَلِلشُّورَیٰ......[1]

اے اللہ! مجھے اس شوریٰ سے کیا لگاؤ؟

یہ محفل میرے قابل نہ تھی، میں اس کی شکایت اللہ کے ہاں کرتا ہوں، یہ میرے شایانِ شان نہیں تھی، میں اس سے بہت برتر ہوں، یہ بہت بڑی جفا ہے۔ جب حضرت علیؑ سے حکومت لے لی گئی تو آپ علیہ السلام نے ذرہ برابر افسوس نہیں کیا، وہ ضربت کہ جس کو ہم آج تک رو رہے ہیں اور قیامت تک نسلیں افسوس کرتی رہیں گی لیکن حضرت علی علیہ السلام کو افسوس نہیں ہوا بلکہ فرمایا:

فُزْتُ وَرَبِّ الْکَعْبَۃِ......[2]

ربِّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوا......

---

[1]......نہج البلاغہ، خُطبۂ شَقْشَقِیَّہ، خطبہ ۳

[2]......(الامثل فی تفسیر کتابِ اللہ المُنزَل - الشّیخ نَاصِر مَکارم شیرازی مدظلہ، جلد۱۴، صفحہ۲۶۱) (شرح اُصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ) (میزان الحکمۃ - الریشہری، جلد۵، صفحہ۱۱۶) (بحار الانوار - علامہ محمد باقر مجلسیؒ، جلد۴۲، صفحہ ۲۳۹) (خصائص الائمۃ علیہم السلام، جلد۵، صفحہ۵۶) (العجاب فی بیان الاَسباب - اَبوالفضل اَحمد بن علی بن محمد بن اَحمد بن حجر العسقلانی، المتوفی: ۸۴۲ھ، الجزء۲، صفحہ۷۸۹) (بیان المعانی [مرتب حسب ترتیب النزول] - عبد القادر بن ملّا حویش السید محمود آل غازی العانی، المتوفی: ۱۳۹۸ھ، جلد۵، صفحہ۴۲۷) (شرح نہج البلاغۃ - ابن ابی الحدید) (شرح نہج البلاغۃ - عبد الحمید بن ہبۃ اللہ بن محمد بن الحسین بن اَبی الحدید، اَبو حامد، عز الدین، المتوفی: ۶۵۶ھ، الجزء۹، صفحہ۲۰۷)

امامِ محافظ اقدارِ دین

اگر امام علیہ السلام کو مفتیوں کے کٹہرے میں لا کے کھڑا کریں تو حضرت علی علیہ السلام کی فریاد نکل جائے گی:

فَيَا لَلّٰهِ وَلِلشُّورٰی......

مجھے یہاں لا کے کھڑا کیا گیا؟ میرا یہ مقام ہے؟ محافظِ دین کہاں اور مفتی کہاں؟

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا۝[1]

اللہ نے بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ زیادہ رکھا ہے اور اللہ نے ہر ایک سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں اجر عظیم عطا کیا ہے۔

لہٰذا یہ نہیں کہہ سکتے کہ دوسرے لوگ بھی مدینہ میں تھے لیکن چونکہ کوفیوں نے امام حسین علیہ السلام کو بلایا لہٰذا امام نے قیام کیا بلکہ لوگوں نے اپنی اپنی جانیں بچالیں۔ مختلف طریقوں سے سب نے اپنی جان بچائی۔ بعض نے دین و شریعت کے نام پر، بعض نے احتیاط کے نام پر، بعض نے دوراندیشی کے نام پر اور بعض نے وظیفۂ شرعی کے نام پر اپنی اپنی جان بچالی۔ جان بچانے کے ہزاروں راستے ہیں لیکن جان دینے کا ایک ہی راستہ ہے۔ جان بچانے کے راستے امام حسین علیہ السلام کو بھی معلوم تھے، ان میں اور امام حسین علیہ السلام میں فرق یہی تھا کہ ان کو صرف جان بچانے کے راستے معلوم تھے لیکن امام حسین علیہ السلام کو جان بچانے اور جان دینے کے دونوں راستے معلوم تھے۔

---

[1] ......سورۂ نساء، آیہ ۹۵

فی سبیل اللہ جان دینے کا ایک ہی راستہ ہے اور یہ بہت سخت راستہ ہے۔ تمام انبیاءؑ کی ایک مشترک سیرت قرآن نے ذکر کی ہے اور ائمہ علیہم السلام کی بھی یہی سیرت تھی کہ یہ مشکلات خریدتے تھے، دشمنیاں مول لیتے تھے، خدا کی راہ میں دشمنیاں مول لینا ان کی سیرت تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر فرعون کو لڑنے کے لیے چُنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عید کے دن دشمن ڈھونڈ رہے تھے۔ سارے لوگ جشن منانے گئے اور ابراہیمؑ دشمنوں کے پیچھے گئے۔ نمرود سے چھوٹا دشمن ابراہیمؑ کو نہیں چاہیے تھا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ...... [1]

اورلوگوں میں سے (خدا کے بندے) کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں......

امام حسین علیہ السلام بھی وارث انبیاءؑ ہیں لہٰذا آپؑ نے ارث میں کیا لیا؟ دفاعِ اقدار، دین کی حفاظت اور خدا کی راہ میں دشمنیاں مول لینا، یہ ارثِ انبیاء علیہم السلام ہے۔ اس لئے امام حسین علیہ السلام نے دشمن کا پیچھا کیا، بیعت بھی ایک بہانہ بن گئی، کیونکہ اقدار کی حفاظت پر مامور ہیں، لہٰذا فرماتے ہیں:

اَلَا تَرَوْنَ اِلَى الْحَقِّ لَا يُعْمَلُ بِهِ ، وَاِلَى الْبَاطِلَ لَا يُتَنَاهٰى عَنْهُ! لِيَرْغَبَ الْمُؤْمِن فِى لِقَاءِ اللّٰه...... [2]

امام حسین علیہ السلام نے بتادیا کہ ان حالات میں مومن کو چاہئے کہ وہ خدا سے ملنے کی آرزو کرے۔ ایک غیور کو جھنجھوڑنے کے لیے بس یہی کافی ہے کہ حق پر عمل نہ ہو، یہ غیور کی غیرتِ دینی کا تقاضا ہے،

امام، محافظ اقدار و دین

---

[1] ...... سورۂ بقرہ، آیہ ۲۰۷

[2] ...... (بحار الانوار، جلد ۴۴، صفحہ ۱۹۳) (تحف العقول، صفحہ ۲۴۵)

اقدار پائمال ہو جانا اس کے لئے بہت بڑی بات ہے، سب سے بڑا غیرت مند بھی وہ ہے کہ جس میں غیرتِ دینی ہو ورنہ غیرتِ ناموس تو حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے۔ سب سے بڑی ناموس دین اور دینی اقدار ہیں، لٰہذا واقعۂ کربلا ایک امام کا امامانہ اقدام تھا، یہ قیام نظامِ امامت کے مطابق تھا اور یہی امامت کا تقاضا تھا۔

ج: امام حسین علیہ السلام اسوہ ہیں

پہلے تحریر کر چکے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام اپنے ماقبل سے بھی مربوط ہیں اور اپنے مابعد سے بھی، یعنی ماقبل کے لیے وارث ہیں اور مابعد کے لیے اسوہ ہیں۔ اسوہ یعنی نمونہ، یہ ایک قرآنی تعبیر ہے۔ مفہومِ اسوہ کی بھی وضاحت چاہیے، یہ بھی اتنا روشن اور واضح مفہوم نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم معصومین علیہم السلام کو بعنوانِ اُسوہ نہیں اپنا سکے۔

کسی کے امر و نہی کو سن لینے، اس کی بات مان لینے کو اسوہ نہیں کہتے بلکہ یہ اطاعت ہے، لٰہذا ممکن ہے کہ ہم مطیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ...... [1]

اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی ......

لیکن ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ

---

[1] ...... (سورۂ نساء، آیہ ۵۹) (سورۂ نور، آیہ ۵۴) (سورۂ محمدؐ، آیہ ۳۳)

[2] ...... سورۂ احزاب، آیہ ۲۱

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ......۲

بتحقیق تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے......

یہ ایک حالتِ تکرار نہیں ہے یعنی اطاعت کرو اور اسوہ اپناؤ کے ایک ہی معنیٰ نہیں ہیں بلکہ اطاعت اور اسوہ اپنانے میں فرق ہے۔ قرآن کریم نے دونوں پر تاکید کی ہے۔ ممکن ہے ہم کسی کی اطاعت کرتے ہوں لیکن اسے اسوہ نہیں مانتے ہوں مثلاً والدین کی اطاعت کرنا واجب ہے لہٰذا ہم والدین کی اطاعت کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں لوگ والدین کی اطاعت کرتے تھے، آج اس ماڈرن دور (Modern Era) میں اگر اطاعت نہیں کرتے تو یہ الگ بات ہے، لہٰذا ممکن ہے کوئی والدین کی اطاعت کرتا ہو لیکن اس کا اسوہ کوئی اور ہو مثلاً کسی علمی شخصیت، مذہبی یا سیاسی شخصیت، کسی معلم یا کسی فیلسوف کو اسوہ کے طور پر مان لیا ہو۔ بہر حال امام حسین علیہ السلام اسوہ ہیں جیسا کہ خود فرماتے ہیں،

لَکُمْ فِیَّ اُسْوَةٌ......

میری ذات تمہارے لیے اسوہ ہے، یعنی میں نے یہ جو تحریک شروع کی ہے، اس میں تمہارے لیے نمونہ ہوں۔ واقعۂ کربلا ایک تحریک کا نام ہے، ایک حرکت ہے اور اس حرکت کا آغاز کرنے والے امام حسین علیہ السلام ہیں۔

امام حسین علیہ السلام اسوہ ہیں

۱......سورۂ احزاب، آیہ ۲۱

حرکت کی تعریف

ویسے تو ہم سب کے ذہنوں میں حرکت اور موومنٹ (Movement) کا ایک تصور ہے لیکن اسے بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے حرکت کا معنیٰ معلوم ہے، اس لیے کہ ہر فرد خود حرکت کرتا ہے، دوسروں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس کی تعریف زبان پر نہیں آتی، اس لیے کہ بعض چیزیں جو ذہن میں ہوتی ہیں وہ زبان پہ نہیں چڑھتیں۔ حرکت کی تعریف یہ ہے کہ حرکت ایک ایسی حالت اور کیفیت کا نام ہے جس میں ایک شے دو لمحوں میں، دو سیکنڈز میں ایک ہی نقطے پر نہ ہو، ایک آن میں ایک نقطہ پر ہو، دوسرے سیکنڈ میں کسی اور نقطہ پر ہو اور اسی طرح حرکت کرتے ہوئے جہاں رُکنا ہے وہاں تک پہنچ جائے، یہ حرکت ہے، اس کے مقابلے میں سکوت اور جمود ہے یعنی ایک شے ایک ہی نقطہ پر ٹھہری ہوئی ہو، لمحے گزرتے جائیں اور وہ وہاں ساکن رہے۔ جب ایک چیز حرکت کر رہی ہو اور آگے بڑھ رہی ہو، دم بدم اگلے نقطے پر پہنچ رہی ہو تو واضح ہے کہ کسی سمت کسی مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے ورنہ یہ حرکت نہیں ہوگی۔ ہر حرکت کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے ورنہ وہ حرکت نہیں کہ جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔

تحریک بھی حرکت دینے اور حرکت دلانے کو کہتے ہیں، ''تحرّک'' حرکت میں آنے کو کہتے ہیں، امام حسین علیہ السلام کا قیام تحرّک بھی تھا یعنی حرکت میں آئے اور یہ قیام تحریک بھی تھا یعنی دوسروں کو حرکت میں لائے۔ یہ حرکت کس انتہا پہ جا پہنچی؟ اسی انتہا پر جو اس کا مقصد تھا، لہٰذا تحریکِ کربلا کا مقصد لوگوں کو حق پرست بنا کر حق کا دفاع کرنا ہے۔ حق کا احساس پیدا کرنا، حق کی خاطر کٹ مرنا اس حرکت کا مقصد ہے۔ یہ وہ جامع مقصد ہے کہ جس کے تحت سارے مقاصد آجائیں گے۔

سب سے بڑی مشکل جو امام علیہ السلام نے دیکھی کہ جس میں حکمران سے لے کر ایک ایک فرد مبتلا تھا، دینی، غیر دینی لوگ، شرابی کبابی، فاسق وفاجر، متقی و پرہیز گار سب کے سب اس مشکل میں گرفتار تھے اور وہ مشکل تھی حق سے بے اعتنا و لا پرواہونا، حق کی بات سے بے توجہ ہونا، لا پروائی، بے حسی اور سکوت و جمود۔ معاشرے میں ایسا جمود طاری تھا کہ حق کو کچلتے ہوئے دیکھ کر اعتراض تک نہیں کرتے تھے۔

جامد معاشرہ جوہڑ کی شبیہ

ظاہر سی بات ہے کہ جہاں جمود اور سکوت آجائے وہاں بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ جیسا کہ گندے کیڑے اور جونکیں ہمیشہ رکے ہوئے جوہڑوں میں ہی پیدا ہوتی ہیں، جوہڑوں یعنی رکے ہوئے پانی میں ہمیشہ مینڈک، جونکیں، گندے کیڑے، مہلک امراض اور جراثیم پیدا ہوتے ہیں، پانی اس وقت پانی ہے جب تک چلتا رہے، جب تک اس میں روانی ہو۔ پانی جب رک جائے اور جوہڑ کی شکل اختیار کرے تو اس میں بہت مضر اثرات پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

معاشرہ اور سماج بھی پانی کی طرح ہے، جب معاشرہ رک جائے، اس میں سکوت اور جمود آجائے تو وہ جوہڑ بن جاتا ہے اور اس جوہڑ میں بہت سے جونک صفت انسان پیدا ہوتے ہیں جبکہ بعض مینڈک کی مانند بھی ہیں۔

مینڈک کا کام ہے ٹرّانا، یہ ٹرٹراتا رہتا ہے جسے سن سن کر کان بہرے ہو جاتے ہیں، کبھی جوہڑ کے قریب سے گزریں تو صبح و شام ٹرٹرانے کی آوازیں آتی رہیں گی، مینڈک شور مچاتے ہیں جبکہ جونکیں

اور مگر مچھ شور نہیں مچاتے بلکہ آرام سے اپنے شکار کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں۔

جامد معاشرے کے جوہڑوں میں بھی یہ ہی طبقے ہوتے ہیں، کچھ مینڈکوں کی طرح ٹرّاتے ہیں اور کچھ جونکوں کی طرح آرام سے خون چوستے ہیں۔ ایک اِدھر سے بول رہا ہے تو ایک اُدھر سے بول رہا ہے، ایک ادھر ہانک رہا ہے، ایک اُدھر ہانک رہا ہے، ایک کا اِدھر گلا پھولا ہوا ہے، دوسرے کا اُدھر گلا پھولا ہوا ہے، بول بول کے گلے بٹھا دیتے ہیں۔ جدھر سے دیکھو آوازیں آرہی ہیں اور شور مچ رہا ہے۔ اگر پورے کا پورا معاشرہ ٹرّانا شروع کردے تو سمجھو یہ انسانیت کا جوہڑ ہے، اس میں جونکیں بھی ہیں جو خون چوسیں گی اور ٹرانے والے بھی جو بہت ڈینگیں مارنے والے ہوتے ہیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں اور وہ بھی اپنے ساتھیوں سے نہ کہ دشمنوں سے:

تَقُولُونَ فِي الْمَجَالِسِ كَيْتَ وَ كَيْتَ، فَإِذَا جَاءَ الْقِتَالُ قُلْتُم حِيدِي حَيَادِ...... [1]

اپنی مجلسوں میں تو تم کہتے پھرتے ہو کہ یہ کردیں گے اور وہ کردیں گے اور جب جنگ چھڑ ہی جاتی ہے تو تم اس سے پناہ مانگنے لگتے ہو......

پھر اس جوہڑ میں یزید جیسے گندے کیڑے اور جونکیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر بشری معاشرہ حرکت میں ہوتا، سیلان اور روانی میں ہوتا تو ہرگز یزید جیسا گندہ کیڑا اس میں پیدا نہ ہوتا، اگر پیدا ہوتا تو اس کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا، اگر ابھر بھی جاتا تو اس کو حکومت کرنے کا موقع نہ ملتا۔ یزید ایک ایسا فرد تو نہیں تھا جو بیٹھے بیٹھے گھر سے آیا اور آکر تختِ حکومت پر بیٹھ گیا بلکہ کسی نے میدان بنایا، کسی نے اس کو موقع دیا،

[1] ......نہج البلاغہ، (خطبہ ۲۹)

کسی نے اس کا ساتھ دیا۔

اب اگر اس جوہڑ کو ختم نہ کیا جائے اور روز بروز دوسرے جوہڑ بھی پیدا ہونا شروع ہو جائیں تو ان میں کیڑوں کی تعداد بھی بڑھ جاتی ہے، جوہڑ میں جتنی زیادہ دیر کے لئے پانی ٹھہرا رہتا ہے اتنی ہی جلدی پورا جوہڑ بدبودار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اتنی سخت بدبو اٹھنا شروع ہو جاتی ہے کہ وہاں کے قریب سے گزرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ جب پانی رک جائے اور اس میں گندے کیڑے پیدا ہو جائیں، جراثیم اور مضر اثرات پیدا ہوں تو گندے کیڑوں کو مارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس پانی میں روانی پیدا کی جائے، اس کو دریا یا نہر بنا دیا جائے، اس میں تلاطم اور موجیں ایجاد کی جائیں تا کہ وہ حرکت کرے، جب جا کے یہ کیڑے اور جراثیم ختم ہوں گے۔ جب تک پانی میں ہل چل نہیں آتی، طوفان و تلاطم پیدا نہیں ہوتا تو یہ اور زیادہ فاسد ہوتا جائے گا۔ اس میں بہت بڑی چٹان یا بہت بڑا پہاڑ پھینکنے سے تلاطم اور حرکت آجاتی ہے۔

یزید کے زمانے میں اسلام کو جمود سے دوچار کر دیا گیا تھا، حالانکہ اسلام ایک حرکت کا نام ہے،

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیَاتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.....[1]

وہی تو ہے جس نے مکہ والوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے.....

---

[1] .....سورۂ جمعہ، آیہ ۲

خدا نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابھارا اور اکسایا تا کہ یہ دوسروں کو بھی ابھاریں اور اکسائیں لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر ابھارا اور اکسایا، لیکن پچیس، تیس سالوں کے اندر اس ابھری ہوئی انسانیت کو دوبارہ بٹھا دیا گیا، اس کے اندر جمود و سکوت پیدا کر دیا گیا۔

امام حسین علیہ السلام جمود شکن

ظاہر ہے یہ جمود فقط کوفے کے اندر نہیں تھا، فقط مدینے کی بات نہیں تھی، فقط ۶۱ ہجری کی بات نہیں تھی بلکہ پورے کرّۂ ارض اور قیامت تک اس ساکن اور جامد سمندر میں تلاطم برپا کرنا تھا، اس میں موجیں اٹھانی تھیں، لیکن یہ کیسے اٹھیں گی؟ اس کے لئے ایک بہت بڑی چٹان چاہئے، اس کے لئے ایک بہت بڑا کرّہ، ایک بہت بڑا سیّارہ چاہئے جو آ کر اس سمندر میں گرے تا کہ سب کچھ ہل جائے، وہ آ کر گرے تا کہ اس میں تلاطم اور موج آ جائے۔

اس زمانے میں امام حسین علیہ السلام سے زیادہ کوئی بڑی چٹان موجود نہیں تھی، کوئی اور اس میں کود پڑتا تو اتنی بڑی موج ایجاد نہ ہوتی۔ لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے بے حس ترین، ساکت ترین، لاپرواترین اور جامد ترین معاشرے میں موجیں اور تلاطم ایجاد کیا جو آج تک رکنے نہیں پایا۔ یہ دائرہ جو چہار سو پھیل رہا ہے کہاں رکے گا؟ ساحل پہ، مگر اس کا تو کوئی ساحل نہیں، یہ پھیلتا رہے گا، اس کو تحریک کہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے جوہڑوں، اپنے جمود اور سکوت کو، اپنے رکے ہوئے انداز کو تحریک کا نام دے دیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پھیل رہے ہیں، ہم چل رہے ہیں اور آگے بڑھ رہے ہیں۔ رکشے کا نام F-16 رکھنے سے وہ F-16 نہیں بنتا، اس سے ایئر فورس کی مشکل حل نہیں ہوتی، یہ فقط نام ہے، رکشہ رکشہ ہی ہے۔

تحریکِ کربلا، کبھی نہ رکنے والی تحریک

اسی طرح تحریک اگر ہے تو فقط کربلا کی تحریک ہے جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی، کتنے بند اس کے سامنے باندھے گئے؟ کتنی رکاوٹیں اس کے سامنے کھڑی کی گئیں؟ مگر یہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی اور یہ موج جس چیز سے ٹکراتی ہے اس کو بھی ہلا کے رکھ دیتی ہے۔ تحریکِ کربلا یہی ہے کہ رکتی نہیں اور قیامِ مقدس امام حسین علیہ السلام کا مقصد بھی یہی تھا کہ قیامت تک یہ تحریک رکنے نہ پائے۔ جس دن تم میں جمود و سکوت آ گیا تو سمجھ لو کہ کربلا کی حقیقت سے دور ہو گئے۔

امام خمینی رضوان اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایران کے اندر یہ جو انقلاب آیا یہ ایک موجِ الٰہی تھی جو اٹھی اور اس نے سکوت و جمود کو توڑ دیا۔ پہلے ایرانی معاشرہ سکوت و جمود کی وجہ سے اتنا متعفّن معاشرہ بن چکا تھا کہ اس میں دنیا کی گندی ترین شخصیتیں اور گندے ترین انسان پیدا ہوتے تھے، اس معاشرے کو ہلانے کی ضرورت تھی لہٰذا امام خمینیؒ نے ان کو ہلایا تو معاشرے مین حرکت آئی اور انقلاب آ گیا۔ اس تحرّک کے نتیجے میں زندگی آ گئی، بدبو ختم ہوئی اور خوشبو آ گئی، پھر اعلیٰ شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں اور لیڈر بھی پیدا ہوئے۔

واقعۂ کربلا کا فلسفہ یہی ہے کہ یہ ایک تحریک ہے، سارا کا سارا قیام اُسوہ ہے۔ جس دن ہمارے اندر احساسِ حرکت پیدا ہو تو سمجھ لیں کہ ہمارے وجود سے موجِ کربلا ٹکرا گئی اور اس نے آ کر ہمیں بھی ہلا دیا۔ جس دن بیدار ہو گئے تو سمجھیں فلسفۂ کربلا سمجھ میں آ گیا۔ یہ سیمیناروں اور تقریروں کی چیز نہیں ہے۔ یہ کربلا میں جا کر کھڑے ہونے کا نام ہے، حرکت میں آنے کی چیز ہے۔ جو حرکت میں ہے، جس کو سکون، آرام اور چین نہیں ملتا تو سمجھ لے کہ وہ کربلا کے بہت قریب ہے لیکن جس کو بہت سکون

آرام وآسائش نصیب ہے وہ کربلا سے بہت دور ہے۔ مرحوم اقبالؒ نے فرمایا:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں ..... [1]

سمندر میں جب اضطراب اور حرکت نہ ہو تو سمندری مخلوقات اور سمندری ساحلوں کے لئے بہت خطرناک ہے کیونکہ اس میں بدبو، گندگی اور تعفّن پیدا ہوگا۔ آج جتنی گندگی نظر آتی ہے یہ معاشرے میں سکوت و جمود کا نتیجہ ہے، یہ جمود بڑھتا چلا گیا تو گندگی پھیلتی جائے گی لہٰذا اس گندگی کو ختم کرنے کے لئے کربلا سے عملی وابستگی کی ضرورت ہے کیونکہ کربلا حرکت کا نام ہے۔ الغرض اگر ہم امام حسین علیہ السلام کو اپنے لئے اُسوہ قرار دیں تو ہماری زندگی میں حرکت آئے گی۔

---

[1] .....ضربِ کلیم، طالبِ علم، صفحہ ۹۵

فہرستیں:

فہرستِ آیات 205

فہرستِ روایات 211

فہرستِ دعا و زیارات 215

فہرستِ اشعار 216

فہرستِ منابع و مآخذ 220

فہرستِ آیات

آیت	صفحہ	
سورۂ بقرہ		
هُدًى لِّلنَّاسِ.....	۱۸۵	59,61
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَo	۹۴	74
اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ.....	۲۴۶	108
فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ.....	۲۴۹	111
اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ.....	۲۵۷	179
وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ.....	۱۹۵	189
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ.....	۲۰۷	194
سورۂ آلِ عمران		
كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ.....	۱۱۰	79
سورۂ نساء		
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ.....	۹۵	193
اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ.....	۵۹	195

	آیت	صفحہ
سورۂ انعام		
فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ.....	۱۲۵	54
فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ.....	۱۴۹	114
سورۂ یونس		
اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا.....	۳۶	138
سورۂ اسراء		
وَاِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً.....	۱۶	16
وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًاo	۸۵	143
سورۂ طٰہٰ		
رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًاo	۱۱۴	27,143
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰىo	۲۴	51
رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْo	۲۵	52
وَيَسِّرْ لِىْ أَمْرِىْo	۲۶	53
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِىْo	۲۷	53

	آیت	صفحہ
سورۂ احزاب		
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.....	۲۱	196
سورۂ زمر		
هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ.....	۹	31
فَبَشِّرْ عِبَادِo	۱۷	50
الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهٗ.....	۱۸	50
سورۂ احقاف		
مَا هٰذَا اِلَّا أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَo	۱۷	20
سورۂ انشقاق		
يَا أَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ.....	۶	20
سورۂ سجدہ		
أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا.....	۱۸	31

	آیت	صفحه
سورهٔ فاطر		
وَمَا يَسْتَوِى الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُo	١٩	31
وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّوْرُo	٢٠	31
سورهٔ حجر		
وَاِنْ مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ......	٢١	47
سورهٔ نازعات		
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰىo	١٧	51
سورهٔ عنكبوت		
اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ......	٤٥	133
سورهٔ انشراح		
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَo	١	55
سورهٔ نور		
أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ......	٥٤	195

	آیت	صفحہ
سورۂ محمدؐ		
اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ.....	۳۳	195
سورۂ جمعہ		
فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صَادِقِیۡنَo	۶	74
هُوَالَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا.....	۲	200
سورۂ اعلیٰ		
سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰیo	۶	142
سورۂ ملک		
الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا.....	۳	45
ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ.....	۴	45
سورۂ نوح		
قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ.....	۵	158
فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَاءِیۡ اِلَّا فِرَارًاo	۶	158

	آیت	صفحہ
سورۂ قارعہ		
فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗo	٦	116
فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍo	٧	116
وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗo	٨	116
فَأُمُّهٗ هَاوِيَةٌo	٩	116
وَمَا أَدْرَاكَ مَاهِيَهْo	١٠	116
نَارٌ حَامِيَةٌo	١١	116

فہرستِ روایات

صفحہ

حدیثِ قدسی

☆مَا اٰمَنَ بِیْ مَنْ فَسَّرَ بِرَأْیِہٖ کَلَامِیْ..... 138

رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمَنِ 133

☆اَلصَّلٰوۃُ قُرْبَانُ کُلِّ تَقِیٍّ..... 133

☆رُبَّ حَامِلِ فِقْہٍ اِلَی مَنْ ھُوَ أَفْقَہُ مِنْہُ..... 136

☆اِنَّ الْحُسَیْنَ مِصْبَاحُ الْھُدٰی وَسَفِیْنَۃُ النَّجَاۃِ..... 146

☆مَنْ مَاتَ لَا یَعْرِفُ اِمَامَہٗ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً..... 181

حضرت علی علیہ السلام

☆أَتَزْعَمُ أَنَّکَ جِرْمٌ صَغِیْرٌ وَ فِیْکَ انْطَوَی الْعَالَمُ الْأَکْبَرُ..... 48

☆اَیُّھَا النَّاسُ الْمُجْتَمِعَۃُ اَبْدَانُھُمْ، اَلْمُخْتَلِفَۃُ اَھْوَاؤُھُمْ..... 114,164

☆فَالْحَقُّ أَوْسَعُ الْأَشْیَاءِ فِی التَّوَاصُفِ وَاَضْیَقُھَا فِی التَّنَاصُفِ..... 148

صفحه

☆وَاللّٰهِ لَاَنْ اَبِيْتَ عَلٰى حَسَكِ اسَّعْدَانِ مُسَهَّدًا..... 154

☆اِنَّ الْمِسْكِيْنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَمَنْ مَنَعَهُ فَقَدْ مَنَعَ اللّٰهَ وَمَنْ اَعْطَاهُ..... 160

☆يَا اَهْلَ الْكُوْفَةِ مُنِيْتُ بِكُمْ بِثَلَاثٍ وَ اثْنَتَيْنِ:..... 163

☆لَقَدْ كُنْتُ أَمْسِ أَمِيرًا فَأَصْبَحْتُ الْيَوْمَ مَأْمُورًا..... 165

☆كَمْ اُدَارِيْكُمْ كَمَا تُدَارَى الْبِكَارُ الْعَمِدَةُ..... 165

☆يَا اَهْلَ الْعِرَاقِ فَاِنَّمَا اَنْتُمْ كَالْمَرْأَةِ الْحَامِلِ..... 166

☆مُنِيْتُ بِمَنْ لَايُطِيْعُ اِذَا اَمَرْتُ وَلَا يُجِيْبُ اِذَا دَعَوْتُ..... 166

☆فَأَنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَةِ أَوْلِيَآئِهِ..... 167

☆ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ اَتَدْرِىْ مَاالْاِسْتِغْفَارُ؟..... 180

☆أَعْرَفُوا اللّٰهَ بِاللّٰهِ وَالرَّسُوْلَ بِالرِّسَالَةِ وَاُولِى الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ..... 181

☆هَلَكَ فِيَّ رُجُلَانِ:مُحِبٌّ غَالٍ وَ مُبْغِضٍ قَالٍ. 182

☆اَنْزَلْنِىَ الدَّهْرُ..... 191

☆فَيَا لَلّٰهِ وَلِلشُّوْرَىٰ..... 192,193

☆فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ..... 192

صفحہ

حضرت امام حسین علیہ السلام

☆لَکُمْ فِیَّ اُسْوَۃٌ...... 43,44,146,196

☆یَا بْنَ الزَّرْقَاءِ اَنْتَ تَقْتُلُنی اَمْ هُوَ کَذِبْتَ وَ اَثِمْتَ؟...... 67

☆رضا بقضائک و تسلیما لامرک و لا معبود سواک 71

☆صَبْراً یا بَنِی الکِرامِ فَمَا الْمَوتُ اِلاّ قَنْطَرَةٌ تَعْبُرُ بِکُمْ عَنِ الْبُؤْسِ وَالضَّرّاءِ اِلَی الْجِنانِ الواسِعَةِ وَالنِّعَمِ الدّائمةِ...... 75

☆یَزِیْدُ رَجُلٌ فَاسِقٌ شارِبُ الْخَمْرِ قاتِلُ النَّفْسِ الْمُحْتَرَمَةِ مُعْلِنٌ بِالْفِسْقِ...... 80

☆وَعَلَی الْاِسْلامِ السَّلامُ اِذا بُلِیَتِ الْاُمَّةُ بِراعٍ مِثْلِ یَزِیْدَ...... 81

☆اَلا تَرَوْنَ اِلَی الْحَقِّ لا یُعْمَلُ بِهِ ، وَاِلَی الْبَاطِلَ لا یُتَنَاهٰی عَنْهُ!...... 81,173,194

☆وَ اَنّی لَمْ اَخْرُجْ اَشِراً، وَ لا بَطِراً، وَ لا مُفْسِداً، وَ لا ظالِماً، وَ اِنّما خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلاحِ فِی اُمَّةِ جَدّی، اُرِیدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعرُوفِ وَ اَنْهی عَنِ الْمُنْکَرِ...... 82,174

☆فَاِنّی لا اَرَی الْمَوْتَ اِلَّا سَعادَةً وَالْحَیاةَ مَعَ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَرَماً...... 171

صفحه

حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام

☆مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَأْيِهِ فَقَدْ كَفَرَ..... 138

حضرت امام رضا علیہ السلام

☆ان الامامة هی منزلة الأنبياء ، وارث الأوصياء. ان الامامة 183

خلافة الله وخلافة الرسول صلى الله عليه وآله ومقام أمير المؤمنين،

وميراث الحسن والحسين عليهم السلام .

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

☆مَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِناً لِنَفْسِهِ حَافِظاً لِدِيْنِهِ مُخَالِفاً عَلٰى هَوَاهُ 186

مُطِيْعاً لِأَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ يُقَلِّدُوْهُ وَ ذَالِکَ لَايَكُوْنُ اِلَّا بَعْضُ

فُقَهَاءِ الشِّيْعَةِ لَا كُلُّهُمْ.....

فہرستِ دعا و زیارات

	صفحہ
☆اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَاھِیَ.....	27,31
☆یَارَبِّ أَرِنِی الْحَقَّ کَمَا ھُوَ عِنْدَکَ حَتّٰی أَقْضِیَ بِہٖ.....	28
☆رَبِّ زِدْنِیْ تَحَیُّراً.....	143
☆یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزاً عَظِیْماً.....	36
☆السلام علیک یا وارث آدم صفوۃ اللّٰہ.....	145
☆لَمْ تُخْرِجْنِیْ لِرَاْفَتِکَ بِیْ وَلُطْفِکَ لِیْ وَ اِحْسَانِکَ اِلَیَّ فِیْ دَوْلَۃِ أَئِمَّۃِ الْکُفْرِ الَّذِیْنَ نَقَضُوْا عَھْدَکَ وَ کَذَّبُوْا رُسُلَکَ لٰکِنَّکَ اَخْرَجْتَنِیْ لِلَّذِیْ سَبَقَ لِیْ مِنَ الْھُدَی الَّذِیْ لَہٗ یَسَّرْتَنِیْ وَفِیْہِ اَنْشَاْتَنِیْ.....	170

فہرستِ اشعار

علامہ اقبالؒ

صفحہ

☆شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی 74

☆ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کیلئے 190

☆خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں 203

☆گرچہ ہر مرگ است بر مؤمن شکر
مرگ پور مرتضٰی چیزی دگر 74

صفحه

جنگ شاهان جهان غارتگری است
جنگ مؤمن سنت پیغمبری است
جنگ مؤمن چیست؟ هجرت سوی دوست
ترک عالم اختیار کوی دوست
آنکه حرف شوق با اقوام گفت
جنگ را رهبانی اسلام گفت
کس نداند جز شهید این نکته را
کو بخون خود خرید این نکته را 75

☆چون خلافت رشته از قرآن گسیخت
حریت را زهر اندر کام ریخت 89

خاست آن سر جلوه ی خیر الامم
چون سحاب قبله باران در قدم
برزمین کربلا بارید و رفت
لاله در ویرانه ها کارید و رفت 89

صفحه

☆تـــا قیـــامـــت قـطـع استبـداد کـــرد

مـــوج خـــون او چـــمـــن ایـجـــاد کـــرد 89

بهـــر حـــق در خـــاك و خـــون غـلتیـده اســت

پـــس بـــنـــای لا الٰـــه گـــردیـــده اســت

مـدعـــا یـــش سـلـطـنـت بـودی اگـــر

خـود نـکـردی بـا چـنیـن سـامـان سـفـر

دشـمـنـان چـون ریگ صـحـرا لا تـعـد

دوستـــان او بـــه یـــزدان هـــم عـــدد

سـرّ ابـــراهیـــمؑ و اسـمٰـعیـلؑ بـود

یـعـنـی آن اجـمـال را تـفـصیـل بـود 90

الـلّٰـه الـلّٰـه بـای بسـم الـلّٰـه پـدر

مـعـنـی ذبـح عـظیـم آمـد پسـر 91

☆عـــزم او چـــون کـــوهســـاران استـــوار

پـــایـــدار و تـــنـــد سیـــر و کـــامـــگـــار 177

صفحه

تیغ بهر عزت دین است و بس
مقصد او حفظ آئین است و بس
ما سوی الله را مسلمان بنده نیست
پیش فرعونی سرش افکنده نیست
خون او تفسیر این اسرار کرد
ملت خوابیده را بیدار کرد 177

فہرستِ منابع و مآخذ

↵ قرآنِ کریم

↵ نہج البلاغہ

الف

↵ اسرار عاشورا

↵ الاحتجاج طبرسی

↵ الاستفادۃ من عاشوراء

↵ الامام علی علیہ السلام سیرتہ وقیادتہ

↵ الامثل فی تفسیر کتابِ اللہ المُنزَل - الشَیخ ناصِر مَکارم شیرازی مدظلہ

↵ التفسیر والمفسرون

↵ العجاب فی بیان الأسباب - أبوالفضل أحمد بن علی بن محمد بن أحمد بن حجر العسقلانی، المتوفی: ۸۴۲ھ

↵ العوالم، الامام الحسین (ع) - الشیخ عبداللہ البحرانی

↵ الفصول المہمۃ فی أصول الأئمۃ - الحر العاملیؒ

↵ الکافی - الکلینیؒ

↵ الملہوف علی قتلی الطفوف

↵ المناہج التفسیریۃ فی علوم القرآن

↵ امام حسین علیہ السلام از زبان شہید مطہریؒ

آ

↵ آشنایی باتفسیر علمی قرآن

ب

↵ بالِ جبرئیلؑ

↵ بحار الانوار - علامہ محمد باقر مجلسیؒ

↵ بررسی تاریخ عاشورا

↵ بیان المعانی [مرتب حسب ترتیب النزول] - عبدالقادر بن ملّا حویش السید محمود آل غازی العانی، المتوفی: ۱۳۹۸ھ

پ

↵ پیامِ امام امیر المؤمنین علیہ السلام

ت

- تاریخ طبری
- تحف العقول
- تسنیم تفسیر قرآن کریم۔ آیۃ اللہ جوادی آملی مدظلہ
- تفسیر رازی
- تفسیر نور الثقلین

ح

- حماسہ حسینیؑ
- حیاۃ الامام الحسین بن علی علیہما السلام دراسۃ و تحلیل

خ

- خصائص الائمۃ علیہما السلام

د

- دور اہل البیتؑ فی بناء الجماعۃ الصالحۃ

ز

↩ ذخیرة الدارین، موضوع: اصحاب الامام الحسینؑ، تألیف: عبدالمجید بن محمد رضا الحسینی الحائری شیرازی

س

↩ سخنان حسین بن علی علیہما السلام

↩ سخنان حسین بن علی علیہما السلام از مدینہ تا کربلا

↩ سلسلة الأعلام من الصحابة والتابعین

ش

↩ شرح أصول الکافی - مولی محمد صالح المازندرانیؒ

↩ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید

↩ شرح نہج البلاغہ - جعفری

↩ شرح نہج البلاغة - الحائری

↩ شرح نہج البلاغة - عبدالحمید بن ہبة اللہ بن محمد بن الحسین بن أبی الحدید، أبوحامد، عزالدین، المتوفی: ۶۵۶ھ

ص

← صلح امام حسن علیہ السلام

ض

← ضربِ کلیم

ع

← عاشورا حماسہ بزرگ تاریخ

← عقد الفرید

ف

← فتوح

← فضائل وسیرہ امام حسین علیہ السلام - در کلام بزرگان

← فی رحاب ولید الکعبۃ

ق

← قراءات فی بیانات الثورۃ الحسینیۃ

ک

↲ کامل

↲ کلمۃ الامام الرضا علیہ السلام

↲ کلیاتِ اقبالؒ، فارسی

ل

↲ لمعات الحسین علیہ السلام

↲ لواعج الأشجان - السید محسن الأمین

↲ لھوف - سید ابن طاؤسؒ

م

↲ مثیر الاحزان

↲ مرآۃ العقول فی شرح أخبار آلؑ الرسولؐ - العلامۃ المجلسیؒ

↲ مستدرک سفینۃ البحار - العلامۃ آیۃ اللہ الشیخ علی النمازی

↲ مسند الامام علی علیہ السلام

↲ مقتل المقدم

↲ مقتل خوارزمی

← مقتل عوالم

← من قضایا النہضۃ الحسینیۃ

← مناہل العرفان فی علوم القرآن

← موسوعہ روائع الحکمۃ والاقوال الخالدہ

← موسوعۃ عاشوراء - الشیخ جواد محدثی

← موسوعۃ کلمات الامام الحسین علیہ السلام

← میزان الحکمۃ - الریشہری

ن↓

← نفحات الولایۃ فی شرح نہج البلاغۃ